اسلام اور اجتماعیت



صدرالدین اصلاحی

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اسلام اور اجتماعیت

مؤلفہ

صدرالدین اصلاحی

www.KitaboSunnat.com

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

نام کتاب : اسلام اور اجتماعیت
مصنف : صدرالدین اصلاحی
اشاعت : مارچ 2011ء
اڈیشن : 22
تعداد : 1000

اہتمام : عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)
اِسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
3-کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور، پاکستان
ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-37248676-37320961
فیکس: 042-37214974
ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk
ای میل: islamicpak@yahoo.com

مطبع : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/90 روپے

فہرست مضامین

☆..........☆..........☆

عرضِ ناشر

مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب دینی حلقوں میں جانے پہچانے آدمی ہیں۔ متعدد موضوعات پر آپ کی گراں قدر تالیفات مثلاً فریضۂ اقامتِ دین، اساسِ دین کی تعمیر، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، معرکۂ اسلام و جاہلیت وغیرہ علمی اور دینی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اصابت رائے، گہری دینی بصیرت، کتاب وسنت سے براہِ راست استدلال اور ٹھوس علمی مواد آپ کی تالیفات کی خصوصیات ہیں۔

پیش کردہ تالیف ''اسلام اور اجتماعیت'' وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اور دینی لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف فرار پسند طبیعتوں کو رَزم گاہِ خیر و شر میں دعوتِ عمل دیتی ہے وہیں دوسری طرف مجاہدینِ حق کو کش مکش حیات میں سامانِ ثبات قدمی فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب جہاں عافیت کوشوں کے لیے تازیانۂ عمل ہے، وہیں سرگرم عمل سخت کوشوں کے لیے زادِ راہ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب ان تمام اجتماعی مساعی کے لیے ممد و معاون اور باعثِ تقویت ہوگی، جو غیر اسلامی قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔

نیاز مند

مینیجنگ ڈائریکٹر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

مقدمہ

عمل کا زوال اگر زیادہ عرصہ تک باقی رہے تو وہ صرف عمل ہی کا زوال نہیں رہتا، بلکہ پہلے جذبات واحساسات کا، اور پھر افکار وتصورات کا بھی زوال بن جاتا ہے۔ جب کوئی قوم یا ملت اپنی اصل حیثیت زندگی کے میدان میں کھو بیٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے ذہن میں بھی زیادہ دنوں تک ٹھیک ٹھیک محفوظ نہیں رکھ سکتی اور اس پر خود ناشناسی کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ وہ بھولنے لگتی ہے کہ اس زمین پر اس کا وجود کس غرض کے لیے ہے اور اس غرض کو پورا کرنے کے لیے اسے کون سا طرز فکر اور طریق کار اپنانا چاہیے؟

ملت اسلامیہ پر ایک مدت سے یہی نفسیاتی عمل طاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کو قائم کرنا، اور قائم رکھنا، ساری دنیا کے لیے حق کا شاہد اور داعی بننا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا، اور خیر کامل کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا، اس کی منصبی ذمہ داری تھی۔ یہی اس کے وجود کی کل غایت تھی اور یہی اس کی اصل حیثیت تھی۔ اس نے ایک وقت تک اس ذمہ داری کو اس طرح انجام دیا جس طرح انجام دینے کا حق تھا، اور صرف اسی نے نہیں، بلکہ دوسروں نے بھی سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اس ملت کی غایت وجود اور اس کی اصل حیثیت یہ ہے۔ پھر اس کی غفلتوں نے اس کی زندگی کی بساط اُلٹ دی اور اسے اپنی اس حیثیت سے عملاً محروم کر کے رکھ دیا۔ اس محرومی نے فطری طور پر مزید محرومیوں کو جنم دینا شروع کر دیا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ اسے اپنا مقصدِ وجود، اپنے اصولِ حیات اور اپنے دینی تصورات، لفظوں کی حد تک تو ضرور یاد رہ گئے ہیں مگر یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے معانی بھی صحیح طور پر اسے یاد رہ گئے ہیں۔ اور اگر یہ بھی باور کر لیا جائے، تو کم از کم یہ تو کسی حال میں بھی نہیں مانا جا سکتا کہ جذباتی اور فکری طور پر بھی اس کے

اندران کی اہمیت کا احساس باقی رہ گیا ہے۔

انھی اصولِ حیات اور دینی تصورات میں سے ایک اہم ترین چیز اس کے اجتماعی کردار اور اس کی اپنی مخصوص تنظیم کا مسئلہ بھی ہے۔ جو بظاہر ایک مسئلہ ہے، لیکن فی الواقع متعدد مسائل کا جامع ہے، اور غلط نہ ہوگا اگر اسے ملت اسلامیہ کی شہ رگ سمجھا جائے۔ اتنے اہم مسئلہ کی حقیقت سے، اس کی اہمیت سے، اور اس کے عملی مطالبات سے عام دل ودماغ افسوس ناک حد تک بے گانہ ہو چکے ہیں۔ اس بے گانگی کا حال یہ ہے کہ آج ملت کے چارہ سازوں کا ایک گروہ تو اس کے تصور ہی سے پریشان ہو اٹھتا ہے، اور دین کے اجتماعی کردار اور ملت کی تنظیم کو زمانہ کا سب سے بڑا کفر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک لوگ ہر کام کے لیے اکٹھے ہو سکتے ہیں، ہر مقصد تنظیم کی بنیاد بن سکتا ہے، ہر مشن اور ازم، کی خاطر گروہ سازی کی جا سکتی ہے، لیکن مسلمان بحیثیت مسلمان، اور اسلام کی خاطر ہرگز منظّم نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لوگ اگرچہ اس طرح نہیں سوچتے، اور وہ مسلمانوں کے متحد ہو جانے کو اپنی محبوب ترین تمنا سمجھتے ہیں، لیکن مسلمان متحد و منظّم کس لیے ہوں؟ کس طرح ہوں؟ کن بنیادوں پر ہوں؟ اور اگر نہ ہوں تو اس کا حقیقی نقصان کیا ہے؟ یہ جاننے اور بتانے والے ان میں سے بھی بہت کم ملیں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کہنے والے جو کچھ کہتے سنے جاتے ہیں، اس سے بسا اوقات ''كلمةُ حَقٍ أُرِيْدَ بِهَا البَاطِلُ'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ نام تو ملتِ اسلامیہ کی تنظیم کا لیا جاتا ہے، مگر اس کا مفہوم، اس کی غایت، اس کا طریقہ، سب کا سب عموماً وہ ہوتا ہے جو اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی ہوتا ہے۔ مسلمان جس مرکز پر، اور جس طرح بھی متحد ہو جائیں، وہ ان کے نزدیک ''اسلامی اتحاد'' اور ''ملی تنظیم'' ہے۔ حالانکہ اسلام نے مسلمانوں کو صرف اللہ کی کتاب پر اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق ہی منظّم ہونے کی تلقین کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ان کی نظر میں اسلام کی متاعِ مطلوب ہے، حالانکہ اس کو صرف ''جماعت'' نہیں، بلکہ ''الجماعۃ'' مطلوب ہے، اور ''الجماعۃ'' کا مفہوم بقول علامہ رشید رضا مصری، ''زمانۂ نبوت میں مسلمانوں کی ایسی ہیئت اجتماعی سے تھا جو کتاب وسنت کے احکام کو زیرِ عمل لا کر دین کو قائم رکھے۔''

(تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۳۶۷)

اس صورتِ حال کا شدید مطالبہ تھا کہ اس اہم ترین مسئلہ کے تمام ضروری پہلو کتاب وسنت کی روشنی میں بالکل واضح کر دیے جائیں۔ تاکہ جب ملی اتحاد وتنظیم کی باتیں کی جائیں اور کوششیں انجام دی جائیں، تو معاملہ کی حقیقی نوعیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اور یہ اچھی طرح معلوم رہے کہ اسلام نے جس اجتماعیت اور تنظیم کا حکم دیا ہے وہ فی الواقع ہے کیا؟ وہ دین وملت کو کس حد تک مطلوب ہے؟ اور کیوں مطلوب ہے؟

یہ کتاب دراصل اسی مطالبہ کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش کام یاب ہوئی ہو۔

صدرالدین

دوشنبہ، ۲ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ

اسلام میں اجتماعیت کا مقام

انسانی فطرت اور اجتماعیت

جس طرح بچہ کے تصور کے ساتھ ماں کی گود کا تصور بھی آئے بغیر نہیں رہتا، اسی طرح انسانی زندگی کے ساتھ اجتماعیت کا تصور بھی لازماً آتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں پایا جاتا جب انسان اجتماعیت سے یکسر بے نیاز رہا ہو، چنانچہ تاریخ کے دھندلے سے دھندلے گوشوں میں بھی اس کے آثار ناپید نہیں۔ جب ''تمدن'' کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی، جب انسان غاروں کے باہر بھی نہیں آسکا تھا، جب اس نے غلے اُگانے اور کپڑے بنانے کی بات بھی نہ سوچی تھی، جب درختوں کے سائے اور پھل پتے ہی اس کے لیے مدارِ حیات تھے، اس وقت بھی وہ خاندانوں کی شکل میں مل جُل کر رہتا تھا، اور اس اجتماعیت کو وہ اپنا گہوارۂ زندگی سمجھتا تھا۔ پھر جوں جوں اس کا ذوقِ تمدن اُبھرتا گیا، اور وسیع تر اجتماعیت کی رکاوٹیں چھٹتی گئیں، اس کی اجتماعیت پسندی پر بھی جلا آتی گئی۔ خاندانی اکائیاں قبائلی وحدت میں، اور پھر قبائلی وحدتیں قومی اجتماعیت میں تبدیل ہوتی گئیں، اور اب یہ قومی اجتماعیتیں ایک عالمی اجتماعی ادارے، بلکہ ایک بین الانسانی کنبے میں تحلیل ہو جانے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔

انسان کا یہ طرزِ عمل مسلسل کیوں چلا آ رہا ہے؟ وہ پہلے ہی دن سے اجتماعیت کا طالب کیوں ہے؟ اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی یہ طلب کیوں بڑھتی اور نکھرتی گئی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں باتفاقِ رائے یہی کہا جائے گا کہ کچھ ایسے زبردست عوامل ضرور ہیں جو اسے اپنے دوسرے ابنائے نوع سے بے تعلق نہیں رہنے دیتے، جو اسے اندر ہی اندر مجبور کیے رکھتے ہیں کہ ان سے مل کر رہے، اور علیحدگی اور تنہائی کے بجائے ان کی معیت میں زندگی بسر کرے۔ اپنے اندر کی دنیا کا جائزہ لیجیے تو پائیں گے کہ یہ عوامل تعداد میں دو ہیں۔ ''ہم جنسی کی کشش'' اور ''تعاون کی احتیاج''۔

''ہم جنسی کی کشش'' سے مراد یہ ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر اپنے ہم جنسوں سے ایک خاص انس رکھتا ہے، ان کے لیے اپنے اندر ایک گہری کشش پاتا ہے، ان کی معیت اور ہم نشینی میں ایک فرحت بخش سکون محسوس کرتا ہے، اور ان سے یکسر علیحدگی اُسے بے چین بنا دیتی ہے اور مسلسل یا طویل تنہائی وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

''تعاون کی احتیاج'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی ذاتی اور انفرادی قوتیں حد درجہ محدود ہیں، دوسری طرف اُن کے مقابلہ میں اس کی دنیوی ضرورتیں حد درجہ بڑی اور وسیع ہیں، اس لیے یہ قوتیں ان ضرورتوں کے معاملہ میں ہرگز کافی نہیں ہوسکتیں اور وہ انھیں صرف اپنے ذاتی بل بوتے پر کسی طرح پورا نہیں کرسکتا، حتیٰ کہ جن ضرورتوں کو بالکل بنیادی اور ناگزیر ضرورتیں کہا جاتا ہے، ان کا پورا کر لینا بھی اس کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ دوسرے بہت سے لوگ اس کی بلاواسطہ یا بالواسطہ مدد نہ کریں۔

اس طرح اجتماعیت انسان کی فطری طلب بھی ہے اور فطری ضرورت بھی۔ وہ دوسرے افرادِ انسان کی طرف ہم جنسی کے پیدائشی جذبہ کے تحت بے اختیار کھنچتا بھی ہے، اور اپنی دنیوی ضرورتوں کے تحت ان کا محتاج بھی بنا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی فطرت کی گہرائیوں میں اجتماعیت پسندی کی دو مضبوط جڑیں بالکل ساتھ ساتھ اُتری ہوئی ہیں۔ اس لیے اگر وہ اجتماعیت سے کبھی بے گانہ یا بے نیاز نہیں پایا گیا تو یہ ایک قدرتی بات تھی، اور انسان جب تک انسان ہے یہ بات اس کے لیے ہمیشہ قدرتی اور لازمی ہی رہے گی۔

یہ ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے بارے میں علم و دانش کے کسی دَور میں بھی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دورِ قدیم کے مشہور یونانی عالم و فلسفی ارسطو نے انسان کی تعریف میں یہ الفاظ کہے ہیں:

''انسان پیدائشی طور پر ایک سیاسی حیوان ہے۔'' (ارسطو کی سیاسیات، ۱۲۵۳۔الف)

سیاست، ظاہر ہے کہ اجتماعیت ہی کی آخری شکل کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ''سیاسی حیوان'' کے معنی ہوئے وہ حیوان جو آخری اور انتہائی حد تک اجتماعیت پسند واقع ہوا ہو۔ گویا ارسطو کے

نزدیک انسان کی وہ خاص صفت، جو اسے حیوانات سے الگ اور ممتاز کرتی ہے، اس کی یہی آخری درجہ کی اجتماعیت پسندی ہی ہے۔ اس کے اندر اگر یہ صفت نہ ہوتی تو وہ بھی من جملہ دوسرے حیوانوں کے فقط ایک حیوان ہوتا۔

وسطی دَور کے معروف عالم اور محقق علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ:

''افرادِ انسانی کا اکٹھے مل کر رہنا سہنا ایک ناگزیر بات ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اہلِ علم و دانش اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے''

(مقدمہ ابن خلدون)

جہاں تک موجودہ دَور کے علما اور فلاسفہ کا تعلق ہے، اُن کے یہاں تو یہ بات ایسی مسلمہ حقیقتوں کی صف میں شامل ہو چکی ہے جو کسی بحث یا ثبوت کی بالکل محتاج نہیں ہوتیں۔

قرآن مجید علم النفس یا علم الاجتماع کی کتاب نہیں کہ اس میں انسان کے جذبۂ اجتماعیت کے متعلق کوئی براہِ راست گفتگو پائی جا سکے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے دائرۂ بحث میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے پیچھے چونکہ دوسری بہت سی علمی حقیقتوں کی طرح انسانی نفسیات کے حقائق بھی ملحوظ رہتے ہیں، جیسا کہ ملحوظ رہنا چاہیے، اس لیے ضمناً اُن حقائق کی طرف بھی اس نے واضح اشارے کیے ہیں۔ ان اشارات کا جائزہ لیجیے تو صاف محسوس ہوگا کہ قرآن حکیم بھی انسانی فطرت کو اجتماعیت پسند ہی قرار دیتا ہے۔ مثلاً جب وہ یہ فرماتا ہے کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں میں ان کے خالق نے باہمی محبت اور رحم دلی پیدا کر رکھی ہے وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (سورۂ روم:۲۱) تو گویا بالواسطہ وہ یہی کہتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اجتماعیت کا دل دادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح آخرت کی خوش کامیوں اور جنت کی نعمتوں کی تفصیل بیان کرتے وقت جب وہ اہلِ جنت کی ہم نشینی، ہم طعامی اور ہم کلامی کا بھی تذکرہ ضروری سمجھتا ہے[1] تو گویا اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ

[1] مثلاً اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۔ (سورۂ حجر:۴۷)
''جنت والے بھائیوں کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''
یَتَنَازَعُوْنَ فِیْهَا كَاْسًا...... وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ۔ (سورۂ طور:۲۳-۲۵)
''وہ جنت میں شراب بھرے پیالوں کی چھینا جھپٹی کریں گے...... اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر آپس میں باتیں کریں گے۔''

اجتماعیت انسانی فطرت کی ایسی عزیز طلب ہے جس سے وہ دنیوی زندگی میں کیا، آخرت کی زندگی میں بھی اونچی نہیں ہوسکتی، اور وہاں بھی انسان کی تسکینِ خاطر اور تکمیل مسرت اسی وقت ہوگی جب کہ اسے اپنی جنس کے دوسرے افراد کی رفاقت اور مصاحبت میسر ہو۔

اِسلام، دینِ فطرت

انسانی فطرت کا یہ رُخ اپنے سامنے رکھیے۔ اس کے بعد اس امر کی تحقیق کیجیے کہ انسانی فطرت کے مطالبوں کو اسلام کیا حیثیت دیتا ہے؟ تاکہ قیاسی اور اُصولی طور پر اس بات کا فیصلہ ہوسکے کہ اسلامی نظامِ فکر و عمل میں اجتماعیت اور اس کے عملی تقاضوں کو کوئی جگہ ملنی چاہیے یا نہیں؟

انسانی خلقت کے بارے میں قرآن مجید کا فرمانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس (قلب) کا ''تسویہ'' کیا ہے۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (سورۃ الشمس:۷)

''تسویہ'' کے معنی، لُغت میں کسی چیز کو خوب درست کرنے کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ اسی بات کو اس نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ ہم نے انسان کو ''احسن تقویم'' میں پیدا کیا ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ. (سورۃ التین:۴)

''تقویم'' کے معنی سیدھا کرنے کے ہوتے ہیں، اور جب کسی چیز کے باطن اور اس کی صفات کو بھی سامنے رکھ کر اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہو تو اس وقت قدرتی طور پر اس کا مطلب اس چیز کو کسی خاص مقصد کے لیے موزوں و مناسب بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو 'احسنِ تقدیم' میں پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ایسی ساخت عطا کی گئی ہے جو اس کے مقصدِ وجود کے لحاظ سے بہترین ساخت ہوسکتی تھی۔ ان وضاحتوں کے پیشِ نظر انسان کا ''تسویہ'' کرنے یا اسے ''احسن تقویم'' میں پیدا کرنے کا واضح مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس مقصد سے پیدا کیا ہے اور اسے دنیا میں جو فریضہ انجام دینے کے لیے بھیجا ہے، ٹھیک اسی کے حسبِ حال اور حسبِ ضرورت اس کی فطرت بھی اس نے بنائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مقصد اور فریضہ کی انجام دہی

کے لیے جن قوتوں اور صلاحیتوں کی اسے ضرورت تھی، اور جن رُجحانات ومیلانات سے اس کا خمیر اٹھایا جانا چاہیے تھا، ان میں سے کسی ایک قوت یا کسی ایک رجحان سے بھی اسے محروم رکھا گیا ہو، یا ان قوتوں اور رجحانوں کے علاوہ کچھ زائد قوتیں اور رجحانات بھی اس کے اندر پیدا کر دیے گئے ہوں۔

ایک طرف تو انسانی فطرت کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں یہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا کہنا یہ ہے کہ مَیں، اور صرف مَیں ہی، وہ شاہراہ ہوں جس پر چل کر انسان اپنے مقصدِ وجود کو ٹھیک ٹھیک پورا کر سکتا اور اپنے فریضۂ حیات کو صحیح طور پر بجا لا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ عقل کا بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسانی فطرت کو ذرا بھی نظرانداز نہ کرے، بلکہ اس کی بنیاد ٹھیک اسی فطرت پر ہو، اور اس کی تعلیمات دراصل اسی فطرت کے مجمل تقاضوں کی تفصیل اور اسی کی مبہم صداؤں کی توضیح ہوں۔ کتاب الٰہی اور ارشاداتِ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کا یہ تقاضا غلط نہیں۔ حقیقت واقعی یہی ہے کہ اسلام انسانی فطرت کو بال برابر بھی نظرانداز نہیں کرتا، اور اس کی بنیاد کاملاً اُسی فطرت پر قائم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ (سورۂ روم: ۳۰)

''ہر طرف سے کٹ کر اپنے رُخ کو اس دین کی طرف سیدھا کر لو۔ اللہ کی (بنائی ہوئی) اس فطرت کی پیروی کرو جس پر اس نے (تم) انسانوں کو پیدا کیا ہے۔''

یہ اس حقیقت کا واضح اعلان ہے کہ اسلام کی بنیاد جس شے پر رکھی گئی ہے وہ وہی فطرت ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے کو، یا یوں کہیے اسلام کو، جا بجا 'ذکر'، 'تذکرہ' اور 'ذکریٰ' کہا ہے، جس کے لغوی معنی یاد دہانی کے ہیں۔ قرآن یا اسلام کے 'یاد دہانی' ہونے کا مطلب یہ ہے، اور یہی ہو سکتا ہے، کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان پر کہیں سے لا کر لاد دی گئی ہو، اور جس سے وہ یکسر اجنبی رہا ہو، بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس کی بنیادیں اس کے اندرون میں روزِ اوّل سے موجود ہیں، وہ اس کی فطرت ہی کی خاموش آواز ہے، جسے الفاظ کے اندر منتقل کر کے اس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے،

اس خاموش آواز کو سن نہیں رہا تھا اور اپنے اندر کی موجود اس حقیقت کو وہ بھلا چکا تھا، رحمتِ حق نے اس بھلائے ہوئے سبق کو اسے یاد دلایا ——— اسلام کی یہی وہ حیثیت ہے جس کے پیشِ نظر وہ اپنے انکار کو ''کفر'' سے تعبیر کرتا ہے۔ کفر کے لغوی معنی ہیں 'چھپا دینا'۔ گویا اسلام کا انکار دراصل اپنی اُس فطرت کو چھپا دینا اور اس کے رُخِ زیبا پر حق ناپسندی کی سیاہ نقاب ڈال دینا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ اِلاَّ عَلَی الْفِطْرَةِ (اِسْلَام) فَاَبْوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْیُنَصِّرَانِهٖ اَوْیُمَجِّسَانِهٖ. (بخاری)

''کوئی بچہ نہیں جو فطرت اسلام پر نہ پیدا کیا گیا ہو، لیکن (اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ) اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں''

یعنی فطرت انسانی کو ربط و مناسبت صرف اسلام سے ہے۔ ہر بچہ بڑا ہونے پر اسلام ہی کو اختیار کرتا اگر اس سلسلہ میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہوتی۔ لیکن یہ مداخلت بالعموم لازماً ہوتی ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کے والدین اس کے دل و دماغ پر پالنے ہی سے اپنے مذہب کی پالش چڑھانے لگتے ہیں۔ اس لیے بڑا ہوتے ہوتے وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی یا کسی اور قسم کا نامسلم بن کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ اگر کسی بچے کے بارے میں یہ مداخلت نہ ہو، اس کے ماحول کی غیر معمولی طاقت اسے کسی طرف کھینچ نہ لے جائے، اور اس کی اصل فطرت کو اپنی پیدائشی حالت پر آزاد باقی رہنے دیا جائے، اور پھر اس کے سامنے مختلف مذاہب کی تعلیمات ایک ساتھ پیش کی جائیں تو وہ ان تمام میں سے صرف اسلام کو اپنائے گا، مذاہب کے اس مجموعے میں جب اس کی نظر اسلام پر پڑے گی تو وہ اس کی طرف اس طرح جا لپکے گا جس طرح ایک بچہ بہت سی عورتوں کے درمیان صرف اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ ہر دوسرا مذہب انسانی فطرت کی شاہراہ سے ہٹا ہوا ہے۔ اس لیے جس کسی کی فطرت کو والدین کی تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثر نے ہاتھ نہ لگایا ہو وہ ان مذاہب میں اپنے لیے کوئی کشش نہ پائے گا، بلکہ ان سے بے گانگی اور اجنبیت

محسوس کرے گا۔ البتہ اسلام کی طرف کھنچ آئے گا، کیونکہ اسے وہ اپنی فطرت کے عین مطابق پائے گا۔ اس سے گہرا اُنس اور اک جان نواز ہم آہنگی محسوس کرے گا۔ گویا اس کی فطرت اگر خالص فولاد ہے تو اسلام اس کے لیے مصفّٰی مقناطیس ثابت ہوگا۔

ان نصوص اور دلائل کی روشنی میں اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام فطرت کا ترجمان ہے اور اس کی بنیاد اسی فطرت پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ ''وہ فطرت جس پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کا یہی دین ہے۔'' **فطرة الله التي فطر الناس عليها دين الله تعالیٰ۔**

(روح المعانی، جز ۲۱، صفحہ ۴۰)

دین فطرت ہونے کا واضح تقاضا

اگر اسلام دین فطرت ہے اور اس کی بنیاد ٹھیک انسانی فطرت پر قائم ہے، اور اگر انسان کی فطرت میں صرف وہی قوتیں اور رجحانات پیدا کیے گئے ہیں جن کا ان کے مقصدِ وجود نے زبانِ حال سے مطالبہ کیا تھا، تو ان دونوں باتوں کا یہ لازمی اور بدیہی تقاضا ہوگا کہ اسلام انسان کی کسی بھی فطری قوت یا رجحان کے کچل ڈالنے کا روادار نہ ہو، کسی کو اپنی راہ کا روڑا نہ سمجھے، کسی کے جائز تقاضوں کو نہ ٹھکرائے، اور کسی سے خدمت لینے میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لیے ایسا کرنا اگر صحیح ہوسکتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ اُسے تین باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور تسلیم ہو۔ یا تو یہ بات کہ اس کی بنیاد ٹھیک ٹھیک انسانی فطرت پر نہیں ہے۔ یا یہ بات کہ انسانی فطرت میں اس کے خالق نے کچھ ایسی چیزیں بھی پیدا کر رکھی ہیں جو انسان کے مقصدِ وجود کے لیے یکسر غیر ضروری بلکہ ضرر رساں ہیں۔ یا پھر یہ بات کہ وہ انسان کو ادائے فرض اور سچی کامیابی کی صراطِ مستقیم دکھلانے آیا ہی نہیں ہے —— لیکن جب وہ ان میں سے کسی بات کے بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں، بلکہ انھیں دنیا کی سب سے زیادہ غلط اور جھوٹی باتیں قرار دیتا ہے، تو ایسی حالت میں عقل یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ پھر تو اسلام کا رویہ ایک ایک قوت و رجحانِ فطرت کے بارے میں لازماً مثبت اور تعمیری ہونا

چاہیے، اور ضروری ہے کہ ان سب کا وہ احترام کرے، ان کے جائز مطالبات کو تسلیم کرے، انسانی زندگی کے حقیقی مقصد کے حصول میں انھیں کار آمد سمجھے، اور ان سے کام لینے کی ہدایت کرے۔

جس شخص کی بھی نگاہ اسلامی تعلیمات پر سطحی نہ ہوگی وہ شہادت دے گا کہ اسلام کا رویہ، عقل کے اس فیصلے سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ وہ انسان کی ساری فطری قوتوں اور رجحانات کو بالیقین یہی حیثیت دیتا ہے، انھیں ہر لحاظ واحترام کا مستحق ٹھیراتا ہے، ان کے تقاضے پورے کرنے کی ہدایتیں دیتا اور اس کے لیے راہیں متعین کرتا ہے، اور اس بات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ انھیں معیوب سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ پھر اس کا یہ رویہ اور یہ طرز فکر ان قوتوں اور رجحانوں کے ساتھ کسی رعایت کی خاطر اور کسی منفی بنیاد پر نہیں ہے۔ وہ محض اس وجہ سے ان کی پذیرائی نہیں کرتا کہ جب انسان یہ 'علتیں' ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے تو کچھ ان کی بھی مان لی جائے۔ بلکہ ٹھیک اپنے تصور دین کے تحت ایسا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ قوتیں اور یہ رجحانات ایسے ذرائع ہیں جن سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر ہی انسان اپنے مقصدِ وجود کو حسن وخوبی کے ساتھ پورا کر سکتا ہے۔ اور اسی لیے وہ ان کے مطالبات کی صحیح بجا آوری کو دنیا کا نہیں، بلکہ دین کا کام اور عبادت کا فعل قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے اندر کھانے پینے کی، جسمانی آرام وسکون کی، بقائے نسل کی، بیوی بچوں کی پرورش ونگہداشت کی، احباب کی خاطر مدارات کی فطری خواہشیں موجود ہیں۔ اسی طرح وہ غصہ، نفرت، سختی، جنگ، شہوت، گویائی، احساسِ مسرت اور احساسِ غم کی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ بظاہر دیکھیے تو یہ ساری چیزیں دین اور دین داری کے ذوق سے کوئی میل نہیں کھاتیں، بلکہ ان میں سے بیش تر تو ایسی ہیں جو اس کے عین ضد کہی جائیں گی۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ ——— نہیں، یہ سب انسانی فطرت کے جوہر ہیں، اور ان میں سے کوئی چیز بھی بے قیمت یا بلا ضرورت نہیں۔ انسان پر جس طرح اس کے خالق اور پروردگار کے حقوق ہیں، اسی طرح اس کے اپنے نفس کے، اپنے جسم کے، اپنی آنکھوں کے، اپنے اہل وعیال کے، اور اپنے احباب کے بھی حقوق ہیں، اور ضروری ہے کہ ان سارے حقوق کو ادا کیا جائے۔

اِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ (بخاری کتاب الصوم)

''تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھ کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّ لِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۔ (بخاری کتاب الصوم)

''تیرے رب کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے گھر والوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَّ لِاَھْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا فَاَعْطِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ۔ (بخاری کتاب الصوم)

''تیرے رب کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے گھر والوں کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق دار کو اس کا حق دے۔''

حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے اُوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی کارِ ثواب ہے۔

اِبْدَءْ بِنَفْسِکَ فَتَصَدَّقْ عَلَیْھَا۔ (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

''اپنے نفس سے شروع کر اور اس پر صدقہ کر۔''

مَھْمَا اَنْفَقْتَ فَھُوَلَکَ صَدَقَۃٌ حَتَّی اللُّقْمَۃَ۔ تَرْفَعُھَا فِیْ فِی امْرَأَتِکَ۔ (بخاری کتاب النفقات)

''جو بھی تو نے خرچ کیا وہ صدقہ میں شمار ہوگا، حتیٰ کہ جو تیری بیوی نے کھایا وہ بھی صدقہ میں شمار ہوگا۔''

جو شخص جوشِ ریاضت میں آکر مسلسل روزے رکھتا رہے گا وہ ایسا غلط کار ٹھیرے گا گویا اس نے روزے رکھے ہی نہیں۔

لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ۔ (بخاری کتاب الصوم)

نکاح کرنا ہی دین کا تقاضا ہے اور اس سے اعراض کرنے والا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے

تعلق رکھنے کا مستحق نہیں۔

اَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔ (بخاری کتاب النکاح)

انسان میں اولاد کی طلب ہونی چاہیے۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (سورۂ بقرہ:۱۸۷)

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ۔ (ابوداؤد، کتاب النکاح)

مثالی مومنوں، یعنی انبیا علیہم السلام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ صاحب اہل وعیال تھے۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً۔ (سورۃ الرعد،۳۸)

مومن کے لیے ازدواجی وظیفے کی ادائی میں بھی اجر وثواب ہے۔

فِیْ بُضْعِ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ۔ (مسلم،کتاب الزکوٰۃ)

حق اور دین کے معاملے میں اپنے موقع پر بغض اور نفرت کمال ایمان کی ضروری علامت ہے۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ۔

(مشکوٰۃ،صفحہ۱۴،بحوالہ ابوداؤد)

اگر دین کی حفاظت اور حمایت کا تقاضا ہو تو اس کی خاطر جنگ بہترین نیکی ہے۔

قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ النَّاسِ اَفْضَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ۔ (بخاری،کتاب الجہاد)

اور اس قسم کی جنگ کے جذبے سے اگر کوئی سینہ خالی ہے تو وہ ایک سچے مسلمان کا سینہ نہیں ہوسکتا۔

مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ[1]

کفر اور نفاق کے معاملے میں نرمی کا نہیں، بلکہ سختی کا رویہ ایمان کی جان ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (سورۂ فتح:۲۹)

---

[1] جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ نہ اُس نے جہاد کیا اور نہ جہاد کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا ہوا، وہ نفاق پر مرا۔ (مسلم جلد۲)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحم دل اور نرم ہیں۔''

قوتِ گویائی کو معطل کیے رہنا اسلام کا نہیں، جاہلیت کا کام ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَا یَحِلُّ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِیَّةِ. (بخاری، جلد دوم)

اپنے بچوں کو پیار کرنا ایک پسندیدہ عادت اور دینی ذوق کی بات ہے اور اپنے کو اس سے ''بلند'' رکھنا سخت ناپسندیدہ رویہ ہے۔

قَبَّلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ ...... فَقَالَ مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمْ. (بخاری کتاب الآداب)

اپنے کسی عزیز کی موت پر غمگین ہونا اور آنسو بہانا کوئی غیر مستحسن فعل نہیں، بلکہ انسانیت و رحم دلی کا مظاہرہ ہے۔

......هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ. (مسلم، کتاب الجنائز)

یہ ساری شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ایک روشن اور نا قابل انکار حقیقت ثابت کر دیتی ہیں کہ اسلام فطری قوتوں اور میلانوں کو معیوب قرار نہیں دیتا، بلکہ معیوب اس بات کو قرار دیتا ہے کہ انھیں اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے، انھیں ٹھکرایا جائے، اور اُن کے حرکت میں آنے کو دین داری کے خلاف سمجھا جائے۔ وہ اسی خالقِ حکیم کی طرف سے آیا ہوا دین ہے جس نے انسان کو اور اس کی ساری فطری قوتوں کو خلق کیا ہے۔ اس لیے اس کے لیے یہ کسی طرح ممکن تھا ہی نہیں کہ وہ ان میں سے کسی ایک قوت کو بھی بے کار اور فضول قرار دیتا۔ دین اللہ اور دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بنیادی طور پر اس کا تو مقصد وجود ہی یہ ہونا چاہیے کہ انسان کی فطری قوتوں اور رجحانوں سے کام لینے میں اس کی رہنمائی کرے، اسے ان کے غلط استعمال سے روکے اور صحیح استعمال کے طریقے بتائے، نہ صرف طریقے بتائے بلکہ اس کی تلقین بھی کرے۔ اور سچ پوچھیے تو یہی وہ سب سے بڑی مخصوص صفت ہے جو دین اللہ کو دوسرے دینوں سے اور اسلام کو غیر اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔

جب اسلام، دین فطرت ہونے کے باعث، انسان کے ایک ایک فطری رجحان کو توجہ کے لائق ٹھیراتا ہے، اسے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کے وجود کے پیچھے کسی نہ کسی مصلحت اور ضرورت کی کارفرمائی تسلیم کرتا ہے، اور اس بناپر اس کے صحیح تقاضوں کی تکمیل کو اپنی تعلیمات میں لازماً جگہ دیتا ہے ـــــ تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک اجتماعیت پسندی ہی کے رجحان کو، جو بجائے خود انسانی فطرت کا بڑا ہی نمایاں اور قوی رجحان ہے، اس نے مذموم ومردود قرار دے دیا ہو یا اسے نظر انداز کر دیا ہو۔ یہ بات کسی طرح قیاس میں آنے والی نہیں۔ اس کے برعکس، قیاس کا کہنا تو صرف یہ ہے کہ اس نے انسان کے اس فطری رجحان کو بھی، اس کے مقصد وجود کے بارے میں، یقیناً ایک ضرورت کی چیز سمجھا ہوگا، اور اپنی تعلیمات کے اندر اس کے تقاضوں کو بھی وہی جگہ دی ہو گی جس کے وہ مستحق ہیں، نیز ایسے شخص کو اپنا ایک غلط کار پیرو ٹھیرایا ہوگا جو ''مسلم'' ہوتے ہوئے بھی اس کی اس طرح کی تعلیمات کو مناسب اہمیت نہ دے اور ان کا پورا پورا حق ادا کرنے سے کترا جائے ـــــ اور اگر امر واقعی یہ نہیں ہے، اگر اس نے اجتماعیت کے بارے میں یہ رویہ اختیار نہیں کیا ہے تو کوئی شک نہیں کہ عقل وانصاف کی عدالت اس پر بے اصولی اور تضاد پسندی کا شدید الزام لگائے گی، اور اس الزام کی صفائی میں اس کے لیے کچھ کہنا آسان نہ ہوگا۔

آیئے دیکھیں، اپنے دین فطرت ہونے کے اس واضح اصولی مطالبے کو اسلام نے کس حد تک تسلیم کیا ہے؟ اور اجتماعیت کو اس کے یہاں فی الواقع کیا مقام ملا ہوا ہے؟

اجتماعیت کی تسلیم شدہ دینی اہمیت

کتاب وسنت پر جائزے کی ایک اچٹتی نظر بھی اس بات کا یقین دلا سکتی ہے کہ اسلامی نظامِ فکر وعمل سے اجتماعیت کو بے دخل نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس کی اہمیت کا صاف صاف اعتراف کیا گیا اور اس کے تقاضوں کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اگر جائزے کی نظر کو گہرائی میں اُتر کر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو اس یقین کی وسعت کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔ دکھائی دے گا کہ اس نظام میں اجتماعیت کو وہ اہمیت حاصل ہے جو حیرت انگیز حد تک غیر معمولی ہے، جو شاید اپنی نظیر

آپ ہی ہے۔ کوئی پہلو نہیں جو اس اہمیت کو توضیح و تلقین کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہو اور یہاں اسے اختیار نہ کیا گیا ہو، کوئی موقع نہیں جہاں اجتماعی طرزِ عمل اپنانے کی گنجائش نکل سکتی ہو اور اسلام نے اس کی تاکید نہ کر رکھی ہو۔

اس دعوے کی دلیل اور اس اجمال کی تفصیل ہمیں جن چیزوں سے ملے گی وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلام کا عمرانی تصور، یعنی انسان کا وہ موقف جسے اس کا حقیقی عمرانی موقف تسلیم کر کے اسلام نے اسے خطاب کیا ہے۔

۲۔ وہ احکامِ شریعت جو اہل اسلام کی جماعتی تنظیم اور ملّی وحدت کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔

۳۔ وہ دینی ہدایات جن میں زندگی کے عام امور و معاملات کو بھی کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ انجام دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

۴۔ اجتماعیت کے وہ آداب جو فرض عبادتوں کے ضمن میں لازم ٹھیرائے گئے ہیں۔

آیئے، ایک ایک چیز کو لے کر اس کا تفصیلی مطالعہ کریں۔

(۱) عمرانی تصور کی زبان سے

کوئی بھی مذہب اپنے پیرووں کو جب خطاب کرتا ہے تو اپنے ذہن میں انسان کی اصل حیثیت کا کوئی نہ کوئی تعین ضرور رکھتا ہے، اور اسے کسی متعین موقف پر رکھ کر ہی اپنی تعلیمات کا آغاز کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے گریز نہ ممکن ہے نہ صحیح۔ کیونکہ یہ چیز بھی انھی چند چیزوں میں سے ایک ہے جو مذاہب کے اندازِ خطاب کی، ان کے احکام و ہدایات کی، اور ان کی قدروں کی تعیین اور حد بندی کرتی ہیں، اور جن کا لحاظ اگر نہ رکھا جائے تو ان کی تعلیمات کے اندر نہ کوئی توازن پیدا ہو سکتا ہے نہ کوئی معقولیت پائی جا سکتی ہے۔

جن امور میں انسان کی اصل حیثیت اور اس کے قدرتی و حقیقی موقف کا تعین ضروری ہوتا ہے، اُن میں سے ایک عمرانیت بھی ہے۔ ہر مذہب کو یہ پہلے دن طے کر لینا پڑتا ہے کہ آیا انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے اپنی دنیا آپ بسانی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنی ہے، یا اسے اپنے دوسرے

ہم جنسوں کے ساتھ اور ان کے اندر رہنا سہنا ہے؟ اور اگر دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا سہنا ہے تو اس میل جول کا دائرہ کتنا محدود یا کتنا وسیع، اور اس ربط کا رشتہ کتنا مضبوط ہے؟ قدرتاً اسلام نے بھی ان سوالوں کا ایک جواب متعین کر کے ہی انسان کو خطاب کیا ہے، اور اس معاملہ میں بھی اسے ایک خاص مقام پر رکھ کر ہی اس نے اپنی تعلیمات وضع کی ہیں۔ یہ جواب کیا ہے؟ اور اسلام کے نزدیک عمرانی پہلو سے انسان کا حقیقی مؤقف کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک طرف تو اس کا یہ ارشاد سنیے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ.

(الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے ہیں۔''

دوسری طرف اس کا یہ عمل دیکھیے کہ اس کی شریعت پر اجتماعیت کی انتہائی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے، اس کے احکام وہدایات کا ایک خاصا بڑا حصہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے وقف ہے اور اس کی پیروی بھی اس نے اسی طرح لازمی قرار دی ہے جس طرح باقی دوسرے احکام کی، وہ جہاں حقوق اللہ سے بحث کرتا ہے وہیں حقوق العباد کو بھی پوری اہمیت سے لیتا ہے، وہ صرف پرستش کا طریقہ بتا کر خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک پورا نظامِ اطاعت بھی دیتا ہے، منزلی اور عائلی، شہری اور ملکی، اخلاقی اور معاشرتی، تمدنی اور معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی، غرض حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ نہیں جس کے سلسلے میں اس کے احکام موجود نہ ہوں، اور زندگی کی کوئی گزرگاہ نہیں جہاں اس کے ہدایت نامے آویزاں نہ ہوں۔

یہ دونوں اُمور ـــــــ اسلام کا یہ صریح ارشاد اور اس کا یہ واضح عمل ـــــــ جس امر واقعی کا انکشاف کرتے ہیں وہ کسی بحث واستدلال یا کسی وضاحت سے یکسر بے نیاز ہے۔ یہ دونوں بجائے خود اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اسلام نے انسان کو خطاب کرتے وقت ایک ایسے مقام پر رکھا ہے جسے اجتماعیت کا اونچا مقام کہا جائے گا۔ اس کی تعلیمات کے پس منظر میں انسان کا جو

موقف ایک مسلمہ حقیقی موقف کی حیثیت سے موجود ہے وہ قطعی طور پر ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے والی مخلوق کا موقف ہے۔ وہ انسانی افراد کا اس کے سوا اور کوئی تصور رکھتا ہی نہیں کہ یہ ایک قبیلے، ایک قوم، اور ایک معاشرے کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اپنے اسی ''کُل'' کے اجزا بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ گھر بار، کھیت اور بازار، علمی ادارے اور تحقیقاتی مراکز، اسمبلی اور پارلیمنٹ، میدانِ جنگ اور ایوانِ صلح، ہر جگہ کی دابستگیاں اور ضرورتیں رکھتے ہیں۔ اس لیے جب بھی انھیں خطاب کرنا ہو ضروری ہے کہ ان کے اس مسلم اور حقیقی موقف کو سامنے رکھ کر خطاب کیا جائے۔

اگر اسلام انسان کو خطاب کرتے وقت اپنے ذہن میں اس کا عمرانی تصور یہ رکھتا ہے تو یہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کے لیے اجتماعیت کو ایک امر لازم سمجھتا ہے، اور اس حد تک لازم سمجھتا ہے کہ اگر انسان کو اس کی اس حیثیت سے الگ کر دیا جائے تو پھر اس زمین پر اس کا کوئی صحیح مخاطب ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

(۲) تنظیمی احکام کی زبان سے

کوئی شک نہیں کہ اسلام نے فرد کو بڑی اور بنیادی اہمیت دی ہے۔ فرد ہی اس کا ابتدائی اور حقیقی مخاطب ہے۔ جس طرح وہ تنہا پیدا ہوا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات پر چل کر اپنی زندگی کو کامیاب بنانا بھی اسی کی اپنی انفرادی ذمہ داری ہے، اور کل اس کے حضور اپنے عمل کی جواب دہی کے لیے اسے اکیلے ہی حاضر بھی ہونا ہے ——— لیکن اسی کے ساتھ اس کا کہنا یہ بھی ہے کہ وہ راستہ جو انسان کو کامیابی کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے، اجتماع سے کترا کر نہیں جاتا، بلکہ ایک منظّم اجتماعی زندگی کے ٹھیک منجدھار سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اس راستے کی تعیین کرتے ہوئے اس کے ضروری مراحل کے سلسلے میں فرماتا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .... وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

(آلِ عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

''اے ایمان والو...... اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور الگ الگ نہ رہو۔''

''الگ الگ نہ رہو'' یعنی باہم جڑے ہوئے رہو۔ یہ ''الگ الگ نہ رہنا'' اور باہم جڑا رہنا، کس طرح کا اور کس معیار کا ہونا چاہیے، اس کی وضاحت کے لیے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف رجوع کیجیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ. (ترمذی، جلد۲، صفحہ ۴۱)

''جماعت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور انتشار سے پوری طرح الگ رہو۔''

اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

(احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱)

''میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی کا، سمع (یعنی احکام امیر کے سننے) کا، طاعت (یعنی احکام کے ماننے) کا، ہجرت کا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔''

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ جس جماعتی زندگی کا حکم اسلام نے دیا ہے وہ کوئی ڈھیلی ڈھالی جماعتی زندگی نہیں ہے جس کی شیرازہ بندی صرف اخلاقی رشتوں سے ہوئی ہو، بلکہ ایسی متحد اور منضبط جماعتی زندگی ہے جس کو سمع اور طاعت کے آہنی تاروں سے بھی پوری طرح کس دیا گیا ہو۔

پھر یہی نہیں کہ 'جماعت' کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے اور جماعتی زندگی بسر کرنے کا یہ ایک لازمی حکم ہے، بلکہ یہ ایسا لازمی حکم ہے جس کی خلاف ورزی میں نہ ایمان کی خیر ہے نہ اسلام سے رشتہ برقرار رہ سکتا ہے۔ چنانچہ مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ.

(احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ: ۳۲۱)

''جو شخص 'الجماعۃ' سے بالشت بھر بھی الگ ہو رہا، کوئی شک نہیں کہ اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا۔''

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً.

(مسلم جلد۲، صفحہ ۱۲۷)

''جو کوئی امام المسلمین کی اطاعت سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور جماعت المسلمین سے

الگ ہو رہے گا اور اسی حال میں مرجائے گا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔"

جس طرح مسلمانوں کی 'الجماعۃ' سے اپنا جڑا ہوا رشتہ کاٹ لینا ایمان کے منافی ہے اسی طرح اس نظم اجتماعی سے وابستہ نہ ہونا بھی دینی حیثیت سے انتہائی خطرناک حالت ہے:

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم جلد۲، صفحہ۱۲۸)

"جو شخص اس حال میں مرجائے کہ اس کی گردن میں (امام المسلمین کی) بیعت (کا قلادہ) نہ ہو، اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔"

جس "الجماعۃ" کی حیثیت یہ ہو اور جس نظم اجتماعی سے علیحدگی یا بے تعلقی ایک مسلمان کو جاہلیت کی حالت میں پہنچا دیتی ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اندر رخنہ ڈالنے کی کسی جسارت کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرلیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں آپؐ کی ہدایت یہ ہے کہ:

مَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْجَمَاعَةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ. (مسلم جلد۲، صفحہ۱۲۸)

"جو شخص اس جماعت کو، جب کہ وہ متحد ہو، پراگندہ کرنا چاہے، اسے (بدرجۂ آخر) تلوار پر رکھ لو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔"

دوسری طرف قدرتی طور پر، ان لوگوں کا اجر اور مرتبہ قابل رشک حد تک عظیم قرار دیا گیا ہے جو اس نظم اجتماعی کی عملی شکل ——— اسلامی مملکت ——— کی حفاظت اور سالمیت کے لیے جاں بازی دکھائیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:

"ایک شب و روز کی سرحدوں کی حفاظت ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔ اور اگر اسی دوران میں کسی کی وفات ہو جائے تو اس کا وہ عمل نیک، جسے وہ اپنی زندگی میں انجام دیا کرتا تھا، برابر انجام پاتا ہوا شمار کیا جائے گا، اور اسے اس کا رزق ملتا رہے گا، نیز وہ فتنے میں ڈالنے والوں سے مامون رہے گا۔" (مسلم جلد دوم، صفحہ۱۴۲)

"دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہ چھو سکے گی: ایک وہ جو خوفِ خدا سے رو پڑی ہو، دوسری

وہ جس نے رضائے الٰہی کی خاطر سرحدوں کی نگرانی کرتے ہوئے رات گزاردی ہو۔"

(ترمذی، جلد اول، صفحہ ۲۱۰)

اسی طرح اس نظم کی اطاعت کو ایمان کی ایک ضروری علامت بتایا گیا ہے، اور اصحاب امر کی فرماں برداری کو اللہ و رسولؐ کی فرماں برداری قرار دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

مَنْ يُطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ. (مسلم، جلد ۲، ص ۱۲۴)

"جس نے امیر کی فرماں برداری کی اس نے میری فرماں برداری کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔"

'اطاعتِ امیر' کے اس فریضے کو امکان کی آخری حد تک انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن اُمرا کی بھی بیعت اور اطاعت سے کنارہ کشی کی اجازت نہیں ہے جو بُرائیوں میں لت پت ہو رہے ہوں، اور جن کے ہاتھوں رعایا کی پیٹھیں زخموں سے چُور چُور ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ یہ وہ حرکتیں ہیں جو اسلام کی نگاہ میں انتہائی حد تک مبغوض ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پیرووں سے کہتا ہے کہ صبر سے ان مظالم کو برداشت کیے جاؤ اور ان کی امارت کو چیلنج نہ کرو بلکہ معروف میں ان کی برابر اطاعت کرتے رہو۔ اس معاملے میں ایسی غیر معمولی چشم پوشی کی پالیسی اس نے کیوں اختیار کی ہے؟ اور ظالم و فاسق امرا کے بارے میں ایسے انتہائی صبر و انقیاد کا اس نے مسلمانوں کو حکم کیوں دیا ہے؟ محض اس لیے تا کہ ملت کی اجتماعیت محفوظ رہے اور مسلمانوں کا اتحاد، انتشار کی نذر نہ ہونے پائے۔ امام نوویؒ اس طرح کی حدیثوں پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

هٰذه الاحاديث فى الحث على السمع و الطاعة فى جميع الاحوال و سببها اجتماع كلمة المسلمين فان الخلاف سبب لفساد احوالهم فى دينهم و دنياهم. (شرح مسلم، جلد ۲، صفحہ ۱۲۴)

"یہ حدیثیں اس امر کی تاکید کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ اولوالامر کے احکام ہر حال میں سنے اور مانے جائیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہے، کیونکہ اختلاف ان کے لیے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی خرابی احوال کا موجب ہے۔"

یہ ان احکام کا ایک مجمل خلاصہ ہے جو اجتماعی نظم اور ملی اتحاد کے بارے میں اسلام نے اپنے پیروؤں کو دے رکھے ہیں۔ اگر صرف انھی چند ارشادات کو غور سے دیکھ لیا جائے تو اجتماعیت کی وہ قدر و قیمت، جو اسے اسلام میں حاصل ہے، بڑی حد تک بے حجاب نظر آ جائے گی۔ کتاب و سنت کی رُو سے اگر تمام اہل ایمان کا ایک خاص شیرازے (حَبۡلُ اللّٰهِ) میں بندھا رہنا اور 'تفرق' سے دُور رہنا ضروری ہے۔ اگر مسلمانوں پر نظامِ خلافت کا قائم کرنا واجب ہے[1] اگر امام المسلمین کی اطاعت اللہ اور رسول ہی کی اطاعت ہے، اگر جماعۃ المسلمین سے بالشت بھر کی علیحدگی بھی مومن کی گردن کو اسلام کے حلقے سے محروم کر دیتی ہے، اگر 'امام' کی بیعت سے بے نیاز مرجانا جاہلیت کی موت مرنا ہے، اگر الجماعۃ کے اتحاد میں رخنے ڈالنے والے کے خون کی کوئی قیمت نہیں، اور اگر ملت کے اجتماعی نظام (اسلامی مملکت) کی حفاظت سے بڑی کوئی عبادت نہیں ——— تو سوچیے، وہ کون سا مقام ہے جو اجتماعیت کو ملنا چاہیے تھا، لیکن اسلام میں اُسے ملا نہیں ہے۔

(۳) عام اجتماعی ہدایات کی زبان سے

''اجتماعیت'' اور ''اجتماعی نظامِ زندگی'' کے الفاظ جب بولے جاتے ہیں تو عام طور سے ان کا اُونچے سے اُونچا اور وسیع سے وسیع مفہوم بھی ایک باضابطہ نظامِ حکومت کے قیام سے زیادہ نہیں ہوتا۔ گویا عام معاشروں کی حد تک یہی اجتماعیت کا معیارِ مطلوب اور منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے، اور حکومت کے دائرۂ عمل واثر سے باہر کی باقی پوری زندگی اجتماعیت کی بحث سے یکسر آزاد اور بے تعلق خیال کی جاتی ہے۔

• لیکن اسلام اس عام نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے، اور اپنے پیروؤں کو، حکومتی دائرۂ عمل واثر سے باہر کی زندگی بھی، کسی نہ کسی طرح کے اجتماعی نظم کے ساتھ ہی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے جو ہدایات دی ہیں ان کا ایک ترتیب سے مطالعہ کیجیے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] نصب خلافت کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے۔ اس مسئلے پر مفصل گفتگو ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آتی ہے۔

لَا یَحِلُّ لِثَلَاثَةٍ یَکُوْنُوْنَ بِفَلَاةٍ مِّنَ الْاَرْضِ اِلَّا اَمَّرُوْا عَلَیْهِمْ اَحَدَهُمْ.

(المنتقیٰ، صفحہ ۳۳۰)

''ایسے تین آدمیوں کے لیے، جو کسی بیابان میں ہوں، جائز صرف یہ بات ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا کر رہیں۔''

یہ ارشادِ نبویؐ کہتا ہے کہ اگر تین مسلمان بھی کسی جگہ ہوں، حتیٰ کہ اگر وہ کسی الگ تھلگ مقام پر اور سنسان بیابان ہی میں کیوں نہ آباد ہوں، تو بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ایک ان کا امیر ہو اور باقی دو اس کے مامور و ماتحت ہوں۔ اس اجتماعیت اور تنظیم کے، بلکہ یوں کہیے کہ اس ننھے سے ''ریاستی نظم'' کے بغیر ان کی زندگی اسلامی زندگی نہ ہوگی۔

(۲) حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِذَا خَرَجَ ثَلٰثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ. (ابوداود، جلد ا، صفحہ ۳۵۱)

''جب تم میں سے تین آدمی (بھی) سفر کے لیے نکلیں تو چاہیے کہ ایک کو اپنا امیر بنا لیں۔''

یعنی مسلمان کے لیے ہدایت یہ ہے کہ مدتِ سفر جیسا عارضی وقت بھی نظم و امر کے بغیر نہ گزارے۔ اگر تین اشخاص بھی ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو مزاجِ اسلامی کے سراسر خلاف ہوگا اگر انہوں نے اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر سفر نہ بنا لیا ہو، اور اس کی سرکردگی میں وہ یہ سفر نہ کر رہے ہوں۔

(۳) حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ کہتے ہیں کہ لوگوں کی عادت تھی کہ سفر کے دوران میں جب کہیں پڑاؤ ڈالتے تو اِدھر اُدھر پھیل جاتے اور اپنی اپنی پسند کی مختلف جگہیں ٹھیرنے کے لیے منتخب کر لیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ صورتِ حال دیکھی تو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِیْ هٰذِهِ الشِّعَابِ وَالْاَوْدِیَةِ اِنَّمَا ذٰلِكُمْ مِنَ الشَّیْطَانِ.

(ابوداود، جلد اول، صفحہ ۳۵۴)

''تمھارا اس طرح مختلف گھاٹیوں اور میدانوں میں منتشر رہنا صرف شیطان کی وجہ سے ہے۔''

اس تنبیہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

"لوگ پھر کبھی اس طرح منتشر نہ ہوئے، اور جب کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تو ایک دوسرے سے بالکل لگ کر ٹھیرتے، حتیٰ کہ خیال ہوتا اگر انھیں ڈھکا جائے تو ایک ہی کپڑے کے نیچے سب آجائیں گے۔" (ابوداؤد، جلد اول، صفحہ ۳۵۴)

معلوم ہوا کہ بغیر کسی جماعتی نظم کے پورا سفر کر ڈالنا تو درکنار، اس کے دوران میں چند گھنٹوں کا کوئی پڑاؤ بھی اگر اپنے اپنے طور پر کر لیا جائے تو اتنی سی دیر کی بھی زندگی شانِ اجتماعیت سے آراستہ دکھائی نہ دے سکے، تو یہ بات بھی اسلام کو قطعی گوارا نہیں، اور اسے وہ شیطان کی پیروی قرار دیتا ہے۔

(۴) ایک صحابی کسی گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ وہاں انھیں میٹھے پانی کا ایک چشمہ نظر آیا، جس نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ دل نے کہا، کاش میں آبادی چھوڑ کر یہیں آ بستا۔ اس خواہش کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچے اور اجازت طلب کی، تو آپؐ نے فرمایا:

"نہیں، ایسا نہ کرو، کیونکہ اللہ کی راہ میں تمھارا کھڑا رہنا گھر کے اندر پڑھی جانے والی تمھاری ستر برس کی نمازوں سے بھی افضل ہے۔"

لَا تَفْعَلْ فَاِنَّ مَقَامَ اَحَدِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهٖ فِيْ بَيْتِهٖ سَبْعِيْنَ عَامًا۔ (ترمذی جلد اول)

یہ حدیث اس حقیقت کی عکاس ہے کہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ کر تنہائی کی زندگی گزارنے میں چاہے جو بھی دینی اور دنیوی فوائد نظر آتے ہوں لیکن اسلام اپنے پیروؤں کو اُدھر جانے اور اجتماع سے کٹ کر رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں کہ یہ دینی اور دنیوی فوائد خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں مگر ان فائدوں کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں جو ایک منظم اسلامی معاشرے کے اندر ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

غور کیجیے، سفر اور حضر سے متعلق یہ مختلف دینی ہدایتیں اسلامی نظامِ فکر و عمل میں اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں! یہ یقیناً ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں

جس کو صرف اسلام ہی کے اندر موجود پایا جاسکتا ہے، اور جس سے دنیا کا ہر دوسرا معاشرہ اور نظام ناآشنا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ اسلامی زندگی کے اجتماعی تقاضے صرف احکام خلافت کی بجا آوری پر جا کر ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس دائرے سے باہر کی عام زندگی کو بھی اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت انتہائی بلند ہی نہیں، انتہائی وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے، حتیٰ کہ انسان کے عام رہن سہن کا کوئی گوشہ بھی اس کے حدود واثر سے آزاد نہیں۔ علامہ شوکانیؒ ان حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جہاں کہیں بھی تین یا تین سے زائد مسلمان ہوں ان کے لیے حکم شریعت یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا امیر مختلف کرلیں۔ کیونکہ اسی طرح باہمی اختلاف سے محفوظ رہا جاسکتا ہے ——— اور اگر اُن تین افراد کے لیے بھی، جو کسی جنگل میں ہوں یا ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں، حکم شریعت یہ ہے تو اس بڑی تعداد کے مسلمانوں کے لیے جو کسی گاؤں یا شہر میں ایک ساتھ رہتے ہوں یہ بدرجۂ اولیٰ مشروع ہوگا۔" (نیل الاوطار، جلد ۹، صفحہ ۱۵۷)

(۴) عبادتوں کے اجتماعی آداب کی زبان سے

انسانی زندگی کا وہ شعبہ، جسے عرفِ عام کے لحاظ سے عبادتی شعبہ کہنا چاہیے، ایک ایسا شعبہ ہے جہاں اجتماعیت کی رسائی کا تصور بھی مشکل سے کیا جاسکتا ہے۔ عبادتِ الٰہی کا نام لیجیے، ذہن آپ سے آپ گوشوں اور تنہائیوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ خیال ہونے لگتا ہے کہ عبادت خالصتاً دین کا اور آخرت کا کام ہے، کسی پہلو سے بھی دنیا کا کام نہیں، پھر اسے کسی طرح بھی سامان جلوت کیسے بنایا جاسکتا ہے! گھر کی، محلے کی، بستی کی، پورے ملک کی زندگیاں اجتماعی نظم کی محتاج ضرور کہی جاسکتی ہیں، مگر خدا کو یاد کرنے کے لیے بھی کسی اجتماعیت کی ضرورت محسوس کی جائے، یہ بات کچھ سمجھ میں آنے والی نہیں۔ یادِ الٰہی اور عبادت کی تو فطرت ہی گرد و پیش سے بے تعلقی چاہتی ہے۔ غرض عبادت گاہیں اور ریاضت کدے وہ مقامات ہیں جہاں ماسوا کا تصور بھی گوارا نہیں کیا

جاتا ـــــــــ اب اگر کوئی دین، عبادات کے اندر کچھ اجتماعی آداب کو لازم ٹھیراتا ہے تو کہنا چاہیے کہ اس نے اجتماعیت کو اہمیت دینے میں سب سے آخری قدم اٹھا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اس امر کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اس دین میں اجتماعیت کو کس درجہ کی اہمیت ملی ہوئی ہے، اُن آداب اجتماعی سے زیادہ فیصلہ کن اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی جنھیں اس نے اپنی عبادتوں میں ملحوظ رکھنے کا حکم دے رکھا ہو۔ یہ آداب شمار میں جتنے ہی زیادہ ہوں گے، اور انھیں جتنا ہی زیادہ ضروری ٹھیرایا گیا ہوگا، کوئی شک نہیں کہ اس دین میں اجتماعیت کا حاصل شدہ مقام اتنا ہی اونچا قرار پائے گا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، بالیقین وہ ایک ایسا ہی دین ہے جس کی عبادتوں میں اجتماعی آداب سموئے ہوئے ہیں۔ کس حد تک اور کس اہمیت کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں؟ اس امر کا تفصیلی جائزہ ذیل کی سطروں میں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ نماز:

اس سلسلے میں ہمیں قدرتی طور پر سب سے پہلے نماز کو لینا چاہیے۔ کیونکہ ساری عبادتوں میں وہ سب سے بڑی عبادت ہے، پورے دین کا مغز اور بندگی کا سرچشمہ ہے، اور اُسے اسلام کا شاہ ستون (عِمَادُ الدِّيْنِ) فرمایا گیا ہے۔ اس عبادت کو جن شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں یہ امور بھی شامل ہیں:

(الف) نماز ادا کرتے وقت ہر مسلمان کا رُخ ایک ہی خاص مقام (کعبہ) کی طرف ہونا چاہیے:

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط (البقرہ: ۱۴۴۔۱۵۰)

''اور جس جگہ بھی تم ہو اپنے رُخ اسی (کعبہ) کی طرف پھیر لو۔''

کسی کا مسلمان تسلیم کیا جانا موقوف ہے اس بات پر کہ وہ کعبہ ہی کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھے۔

مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ۔ الخ

(بخاری جلد ا صفحہ ۵۶)

ایک ہی خاص مقام کی طرف رُخ کرنے کا ایسا تاکیدی حکم اس حقیقت کے باوجود ہے کہ

نماز جس اللہ کی یاد کا نام ہے وہ ہر جگہ اور ہر طرف ہے، کسی خاص جگہ یا کسی خاص سمت میں محدود نہیں ہے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کا اعلان کیا ہے اور واضح ترین لفظوں میں کیا ہے:

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ. (البقرہ:۱۱۵)

''پس جس طرف بھی تم منہ کرو اللہ اُدھر ہی ہے۔''

(ب) فرض نمازوں کو ــــــــ ان فرض نمازوں کو جو تمام نمازوں کے درمیان فی الواقع اصل نماز ہیں ــــــــ اکٹھے مل کر ادا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اور نماز باجماعت کا ثواب، اس نماز کے مقابلے میں ستائیس گنا بتایا گیا ہے جو اکیلے پڑھ لی گئی ہو۔ (بخاری جلد ۱) نماز کی یہ باجماعت ادائیگی جس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بارے میں، جو کسی عذر کے بغیر نماز باجماعت سے غیر حاضر تھے، فرمایا:

''میرا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے مقرر کردوں، پھر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز باجماعت میں حاضر نہیں ہوتے، اور حکم دوں کہ لکڑیوں کے گٹھر ڈال کر ان کے سمیت ان کے گھروں کو پھونک دیا جائے۔'' (مسلم جلد ۱)

یہ اس نبیؐ کے الفاظ ہیں جو رحم و شفقت کا پیکر تھا۔ اس کے باوجود تارکِ جماعت کے بارے میں آپؐ کی زبان سے ایسے سخت اور دہشت بھرے الفاظ کا نکلنا بتاتا ہے کہ باجماعت نماز نہ پڑھنا کوئی معمولی کوتاہی نہیں بلکہ ایک سنگین معصیت ہے۔

(ج) نماز کو اکٹھے مل کر اور باجماعت ادا کرنے کے سلسلے میں صرف اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہو جائیں اور پھر اپنے اپنے طور پر اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ سب لوگ صفیں باندھ کر اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں، اور صفیں تیر کی طرح سیدھی ہوں۔ (بخاری جلد ۱)

پھر سب میں سے ایک اہل تر شخص پوری جماعت کا امام ہو، جو سب کے آگے کھڑا

ہو ــــــ اور سب لوگ اس کی اقتدا میں یہ فریضہ ادا کریں، اقتدا ایسی کامل ہو کہ پوری جماعت کی ایک ایک حرکت امام کی حرکت کے تابع ہو، پوری جماعت امام ہی کے ساتھ کھڑی ہو، اسی کے ساتھ جھکے، اسی کے ساتھ سجدے میں جائے، اسی کے ساتھ قعدہ کرے، جس وقت وہ قراءت کر رہا ہو پوری خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی سماعت کرے۔ نماز کی ادائیگی میں اگر وہ کسی بھول چوک کا مرتکب ہو رہا ہو تو بھی اُس کی اقتدا سے علیحدگی اختیار کر لینے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بس 'سُبْحَانَ اللّٰهِ' کہہ کر اسے اس غلطی پر متنبہ کر دیا جائے۔

یہ دونوں باتیں ــــــ صف بندی اور امام کی پیروی ــــــ محض فضائل نماز کا مرتبہ نہیں رکھتیں، بلکہ وہ نمازِ باجماعت کی شرطوں میں داخل ہیں۔ ان میں اگر نقص رہا تو یہ نقص نماز کو بھی ناقص بلکہ بے سود بنا کر رکھ دیتا ہے، اور اس سے صرف آخرت ہی نہیں، دنیا کی زندگی بھی تباہیوں کے خطرات میں جا گھرتی ہے۔ ایک شخص کا سینہ صف سے ذرا باہر نکلا ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی:

عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ. (مسلم، جلد۱)

"اللہ کے بندو! اپنی صفوں کو ضرور ہی درست اور سیدھی رکھو، ورنہ اللہ تمھارے رُخ ایک دوسرے کے خلاف کر دے گا۔"

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"جو شخص نماز کی کسی صف کو جوڑے گا اُسے اللہ جوڑے گا، اور جو کسی صف کو کاٹے گا اُسے اللہ کاٹ دے گا۔" (ابوداؤد، جلد۱)

اسی طرح امام کی اقتدا کے سلسلے میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ:

"جب تم میں سے کوئی شخص امام سے پہلے ہی (مثلاً رکوع سے) اپنا سر اٹھا لیتا ہے تو کیا اسے اس وقت اس بات کا ڈر نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے گا۔"

(مسلم، جلد اول)

(د) نماز کو جماعت کے ساتھ اور ایک امام کی اقتدا میں ادا کرنے کا یہ حکم عام، ظاہر ہے کہ

'محلہ داری' نوعیت کا ہے۔ یعنی اس حکم کا منشا یہ ہے کہ بستی کے ہر محلے کے لوگ اپنی پانچوں فرض نمازیں اپنے محلے کی مسجد میں باجماعت ادا کریں۔ لیکن اس سلسلے میں شریعت اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ابھی اور آگے جاتی ہے، اور ہدایت دیتی ہے کہ ہفتہ میں ایک نماز اس طرح پڑھی جائے کہ بستی کے تمام باشندے ایک ہی مسجد میں اکٹھے ہو جائیں، اور پوری بستی ایک جگہ، ایک امام کے پیچھے، ایک ساتھ اپنے رب کے حضور جھکے۔ یہ جمعہ کی نماز ہے۔ اس نماز کی عظمت اور اہمیت سورۂ جمعہ کا نظم کلام یہ بتاتا ہے کہ اُمتِ مسلمہ اپنا فرض منصبی اسی وقت ٹھیک ٹھیک ادا کر سکتی ہے جب کہ اس کا طرزِ فکر و عمل اپنی حقیقی شان کے ساتھ باقی ہو، اور اس طرزِ فکر و عمل کا اپنی حقیقی شان کے ساتھ باقی رہنا جن باتوں پر موقوف ہے ان میں سے ایک یہ نماز جمعہ کی اقامت بھی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس نماز کا حق نہ ادا کیا تو وہ بھی اسی قانونِ خداوندی کی زد میں آ سکتے ہیں جس کی زد میں آ کر پچھلی ملتیں (خصوصاً ملتِ یہود) ذِلت کی موت مر چکی ہیں۔ کچھ ایسی ہی ہدایت اور تنبیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ آپؐ کا صریح ارشاد ہے کہ:

"لوگوں کو جمعہ کی نماز چھوڑنے سے باز ہی آ جانا چاہیے، ورنہ ایسا ضرور ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دِلوں پر مہر کر دے گا اور پھر وہ حق سے غافل ہو کر رہ جائیں گے۔" (مسلم، جلد اول)

(ہ) نماز میں جو کچھ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اس میں کثرت سے جمع کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔

مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ

"خدایا! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔"

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

"ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔

"ہمیں سیدھی راہ چلا۔"

رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ

''اے ہمارے پروردگار! حمد تیرے ہی لیے ہے۔''

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ.

''سلامتی ہو ہم سب پر اور اللہ کے سارے نیکوکار بندوں پر۔''

وغیرہ ——— اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نماز ادا کرتے وقت لوگوں کو جس طرح ظاہری طور پر اکٹھے اور صف بستہ ہو رہنے کی ہدایت ہے، اسی طرح ذہنی طور پر بھی باہمی وحدت اور یگانگی کا احساس رکھنے کا حکم ہے۔

یہ امور ایسے ہیں جن کے بغیر نماز، نماز ہوتی ہی نہیں۔ واضح طور پر یہ سب اجتماعی آداب ہیں، اور ان کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ نماز کو شعورِ اجتماعیت اور احساسِ نظم وانضباط کا بھی سرچشمہ بنا دیا جائے، مسلمان جس وقت پوری توجہ سے بلکہ اپنے پورے وجود سے اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا ہوا ہوتا ہے اس کے لیے اس وقت بھی ایک جماعت کا جز ہونے کی واقعیت ناقابل فراموش ہو، وہ حضوری کے ان مخصوص ترین لحات میں بھی اپنے کو ایسا مستقل اور بے ہمہ فرد نہ تصور کرے جو اپنے فرائض، اپنے مقصدِ حیات اور اپنے مفادات کے لحاظ سے دوسرے تمام اہلِ ایمان سے بالکل الگ تھلگ ہو، اور ان فرائض کی تکمیل اور ان مقاصد و مفادات کی تحصیل میں ان سے نہ کوئی ربط رکھتا ہو نہ اس ربط کی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ اس کے بخلاف وہ اپنی دعاؤں اور گزارشوں تک سے بھی یہ حقیقت بار بار نمایاں کرتا رہے کہ اس کے سامنے اپنی انفرادیت کا استقلال بھی ہے اور جماعت کا ناقابل فراموش ارتباط بھی۔ وہ خشکی کا مسافر نہیں ہے کہ اکیلے ہی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا، بلکہ کشتی کا مسافر ہے جو عام حالات میں سارے اہلِ کشتی کے ساتھ ہی ساحلِ مراد پر قدم رکھ سکتا ہے۔

اب نماز کے ان سارے اجتماعی آداب کو، اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اس منشا کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایئے کہ اس عبادت میں اجتماعیت کی رُوح کس زور و قوت کے ساتھ رچا بسا

دی گئی ہے، اور اس سے اسلام میں اجتماعیت کا مقام کتنا عظیم دکھائی دینے لگتا ہے، لیکن یہ اندازہ صحیح اور مکمل نہ ہوگا جب تک کہ نماز کے بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت سے ان آداب کی مناسبت کا حال بھی نظر میں ہو۔ نماز کی اصل غرض خدا کے دربار کی حاضری اور اس کا ذکر ہے، اور اس ذکر کی جان، دل کا عاجزانہ جھکاؤ ہے۔ یہ دونوں جانی بوجھی حقیقتیں ہیں۔ غور کیجیے کہ نماز کے اس اصل مقصود کو حاصل کرنے کے لیے کون سا مقام زیادہ سازگار ہو سکتا ہے؟ گوشۂ تنہائی یا مجمع عام؟ یادِ الٰہی کا استغراق، خلوت کا سکون چاہتا ہے یا جلوت کی ہما ہمی؟ دل کو خشوع کی دولت زیادہ آسانی کے ساتھ سنسان فضا میں میسر آیا کرتی ہے یا محرومِ سکوت ماحول میں؟ اس سوال کا جواب کوئی شک نہیں کہ صرف ایک ہی ہوگا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ اللہ کی یاد، دل کی کام یکسوئی چاہتی ہے، اور دل کی کامل یکسوئی، تنہائی کا سکوت مانگتی ہے ——— اب ایک طرف تو نماز کا یہ اصل مقصد، اور اس مقصد کے حاصل ہو سکنے کی یہ مطلوبہ شکل دیکھیے، دوسری طرف شریعت کا یہ فرمان سنیے کہ فرض نمازوں کے لیے اجتماع ضروری ہے اور تنہائی ناقابلِ معافی جرم، پھر اجتماع بھی اجتماع محض نہیں، بلکہ انتہائی معیاری اور پوری طرح کسا بندھا اجتماع ——— صفیں باندھنا ضروری، صفوں کو تیر کی طرح سیدھا رکھنا ضروری، لوگوں کا اس کا مقتدی ہونا ضروری، امام کی پیروی میں اور اس کے اشاروں کے مطابق ہی سب کا ایک ساتھ کھڑا ہونا، ایک ساتھ جھکنا، ایک ساتھ بیٹھنا، ایک ساتھ سجدہ کرنا اور پھر ایک ہی ساتھ نماز ختم کرنا، سب ضروری!!! بات بظاہر کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ نماز کی اقامت ایسے آداب و شرائط پر موقوف ہو جو دل کی یکسوئی اور باطن کے خشوع میں رہ رہ کر خلل ڈال سکتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ اور جو چیزیں نماز کے اصل مقصد تک میں خلل ڈال سکتی ہوں انھیں فعلِ نماز کے اندر گوارا ہی نہیں، بلکہ الٹا ضروری تک کیسے قرار دے دیا گیا ہے؟ اس غور و فکر کے بعد آپ جس نتیجہ پر بھی پہنچیں، اس کے اندر یہ حقیقت بھی لازماً داخل ہی ہوگی کہ شارعِ اسلام کو مسلمانوں کے اندر منظم اجتماعیت کا شعور بیدار اور مستحکم رکھنا انتہائی اور غیر معمولی حد تک عزیز تھا، اتنا عزیز کہ نماز کے اصل مقصد تک کے حصول میں

دشواریاں پیدا ہو جانے کے کھلے ہوئے عملی امکان پر اس نے اس شعور کی بیداری اور استحکام کو ترجیح دی[1] بلاشبہ یہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ملت میں منظم اجتماعیت کے شعور کو بیدار رکھنا بجائے خود اقامتِ نماز کا ایک ذیلی مقصد ہے۔[2]

---

[1] چنانچہ اس امر پر علما کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کو تنہائی میں نماز پڑھنے سے پورا خشوع حاصل ہوتا ہو لیکن جماعت کے ساتھ پڑھنے میں اس کے خیالات اکثر بٹ جایا کرتے ہوں تو بھی اس کے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ فرض نمازیں تنہائی میں ادا کرے اور جماعت کی شرکت چھوڑ دے۔ صرف ایک صاحب، امام غزالیؒ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ یعنی انہوں نے جماعت کی شرکت پر خشوع کے حصول کو ترجیح دی ہے۔ مگر ان کی اس رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ (واما افتاء الغزالی فی من یتحقق من نفسہ انہ یخشع فی جمیع صلوٰتہ منفرداً دون ما اذا صلّٰی فی جماعۃ لتشتت ھمہ بانہ اذا کان الجمع یمنعہ الخشوع فی اکثر صلوٰتہ فالانفراد لہ اولٰی فردوہ) (حاشیہ مشکوٰۃ: ص ۹۶)

[2] اس موقع پر یہ بات بھی یاد دلا دینے کی ہے کہ فرض نمازوں کی باجماعت ادائیگی سے نماز کے اصل مقصد (ذکر الٰہی) کے حصول میں اگر خلل اور دشواری پیدا ہونے کے امکانات ہیں تو شریعت نے اس معاملہ کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ تلافی کی صورت بھی تجویز کر دی ہے اور وہ اس طرح کہ جہاں اس نے فرض نمازوں کو ایسے زبردست اجتماعی آداب کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، وہیں اس امر کی بھی ترغیب دے رکھی ہے کہ دوسری تمام نمازوں کو مسجد کے بجائے اپنے گھروں میں پڑھا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: صَلُّوْا اَیُّھَا النَّاسُ فِیْ بُیُوْتِکُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوۃِ صَلٰوۃُ الْمَرْءِ فِیْ بَیْتِہٖ اِلاَّ الْمَکْتُوْبَۃَ۔ (بخاری جلد اول)

"لوگو! نمازیں اپنے گھروں میں پڑھا کرو، کیونکہ سب سے اچھی نماز وہ ہوتی ہے جسے آدمی اپنے گھر میں پڑھتا ہے، سوائے فرض نمازوں کے۔"

چنانچہ خود آپؐ کا اسوہ بھی یہی تھا۔ آپؐ نفل اور سنت نمازیں اپنے حجرے ہی میں پڑھا کرتے تھے۔ آپؐ کے اس ارشاد اور عمل کی سب سے اہم مصلحت واضح طور پر یہی ہے کہ گھر کی تنہائی میں دل کو پوری یکسوئی میسر ہوتی ہے، اس لیے نماز کا اصل مدعا حاصل کرنے کے لیے یہ جگہ زیادہ موزوں اور سازگار ہے۔ اس طرح یہ نفل نمازیں خشوع باطن کے حصول کی اس امکانی کسر کا پورا پورا بدل مہیا کر دیتی ہیں جو فرض نمازوں میں جماعت کی پابندیوں کے باعث رونما ہو سکتی ہے۔

اب اگر نماز کی فیض بخشیوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیے تو صاف دکھائی دے گا کہ وہ کامل خیر باطن اور کامل خیر ظاہر، دونوں کی جامع ہے۔ وہ اگر باطن کو حق کی حضوری عطا کرتی ہے تو ساتھ ہی ظاہر کو اجتماعیت کے آداب سے مزین، اور نظم و اتحاد کی قوتوں سے مالا مال بھی کرتی رہتی ہے، اس کے اس فیضان سے خواہ آج کے پیروان اسلام کتنے ہی بے خبر کیوں نہ ہو چکے ہوں، مگر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اسلام کے دشمن بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ:

کَانَ رستم اذارأی المسلمین یَجْتَمِعُوْنَ لِصَّلٰوۃ یقول اکل عمر کبدی یعلم الکلاب الآداب۔

(مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۳)

"(مشہور ایرانی سپہ سالار) رستم جب میدان جنگ میں مسلمانوں کو نماز کے لیے اکٹھے ہوتے دیکھتا تو کہہ اٹھتا: عمرؓ میرا کلیجہ کھائے جا رہا ہے، وہ کتوں کو آداب سکھا رہا ہے۔"

۲۔ زکوٰۃ

نماز کے بعد دوسری اہم ترین عبادت وزکوٰۃ' ہے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا اسلامیت کی ان دو بنیادی علامتوں میں سے ایک ہے جو کسی غیر مسلم کے دائرۂ اسلام میں داخل قرار پانے یا نہ پانے کا، سیاسی طور پر فیصلہ کرتی ہیں۔ اس عبادت کے سلسلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

......اِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ. (مسلم جلدا)

''اللہ نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مال داروں سے لی جاتی ہے اور ان کے ضرورت مندوں پر لوٹا (کر بانٹ) دی جاتی ہے۔''

اس ارشاد نبویؐ سے دو خاص باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ اس اہم عبادت کی جو غرض و غایت ہے اس کا ایک رخ (خارجی رُخ) اسلامی معاشرے کے اقتصادی مصالح کی طرف ہے، یعنی یہ جس مقصد سے فرض کی گئی ہے اس کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ ملت کے حاجت مند افراد اپنی معاشی مجبوریوں اور پریشانیوں سے نبٹنے کے لیے بے سہارا نہ رہ جائیں۔ دوسری یہ کہ طریقہ اس عبادت کا یہ ہے کہ مال زکوٰۃ مال دار مسلمانوں سے لیا اور وصول کیا جائے، اور پھر تنگ حال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے، یہ نہیں ہے کہ مال دار مسلمان خود ہی زکوٰۃ نکال کر غریبوں کو دے دیا کریں۔ وصول کیے جاتے اور تقسیم کر دیے جانے (تُؤْخَذُ وَتُرَدُّ) کی بات چاہتی ہے کہ لازماً کوئی ہاتھ ہو جو وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا فریضہ انجام دے۔ واضح طور پر یہ ہاتھ حکومت ہی کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے الفاظ ''وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا'' سے معلوم ہوتا اور دورِ نبوی و دورِ خلافتِ راشدہ کے تعامل سے ثابت ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کو اپنا مالِ زکوٰۃ حکومت کے حوالے کرنا جس درجہ ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عہدِ صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف تلوار سونت لی، اور پوری عزیمت کے ساتھ فرمایا:

وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهٗ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهٖ. (مسلم جلد ا، کتاب الایمان)

''خدا کی قسم! اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی ایک رسی کو بھی جسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے روک رکھا تو میں اس کے لیے اُن سے جنگ کروں گا۔''

زکوٰۃ کے متعلق شریعت کے ان دونوں فرمانوں پر نظر ڈالیے۔ صاف محسوس ہوگا کہ اس نے عبادت کو بھی اجتماعیت کا سرچشمہ بنایا ہے۔ ایک طرف تو اس کے مقاصد ہی میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور مواسات شامل ہے ——— اور یہ وہ عمل اور جذبہ عمل ہے جو صالح اجتماعیت کا سب سے اہم بنیادی پتھر ہے ——— دوسری طرف اس عبادت کے طریق ادا کو اس نے حکومتی نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے ——— جو اجتماعیت کی کامل ترین شکل ہے۔ پھر اس نے ایسا اس حقیقت کے باوجود کیا ہے کہ زکوٰۃ کے اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت کے لیے یہ بات کچھ ناسازگار ہی ہوسکتی ہے، سازگار کسی طرح نہیں ہوسکتی۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد اور اس کی بنیادی غرض وغایت نفس کا تزکیہ ہے۔

تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا. (التوبہ:۱۰۳)

تا کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔

اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى. (الیل:۲۰)

ظاہر ہے کہ اس مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ زکوٰۃ حاجت مندوں کو بطور خود دی جائے، اور اس طرح دی جائے کہ دینے والے کا بایاں ہاتھ بھی یہ نہ جانے کہ دائیں ہاتھ نے کیا اور کسے دیا ہے؟ ورنہ کھلے طور پر، اور وہ بھی حکومت کے اقتدار، نظم، اور ضوابط کے تحت زکوٰۃ دینے کی شکل میں خلوص اور للہیت کے متاثر ہو رہنے کا اندیشہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے نماز ہی کی طرح زکوٰۃ کی زبان سے بھی اپنی اجتماعیت پسندی کی شدت کا مظاہرہ کیا ہے۔

کیونکہ عبادات کے اصل اور بنیادی مقصد کے متاثر ہو رہنے کے امکان اور اندیشے پر اجتماعی آداب اور مصالح کو اس نے یہاں بھی ترجیح دے رکھی ہے۔

(۳) روزہ:

تیسری عبادت روزہ ہے۔ یہ ایک ''منفی'' قسم کی عبادت ہے۔ یعنی اس میں نماز یا زکوٰۃ یا حج کی طرح کچھ کیا نہیں جاتا کہ اسے دیکھا جا سکتا ہو، بلکہ کچھ خاص کاموں سے روکا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس عمل کی نوعیت منفی قسم کی ہو، اس کو اجتماعیت کا جامہ پہنانا دشوار، اور شعورِ اجتماعیت کی بقا و ترقی کا ذریعہ بنانا دشوار تر ہے۔ لیکن روزے کے سلسلے میں شریعت نے جو احکام دیے ہیں ان سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ اُس نے اس منفی عبادت کو بھی اجتماعیت کا ''ہادی'' اور ''معلم'' بنا دیا ہے۔ حکم ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی متعین مہینے میں روزے رکھیں، ہر روز تقریباً ایک ہی وقت سحری کھائیں اور پھر ایک ہی متعین وقت پر افطار کریں۔ ان احکام کے نتیجے میں اس عبادت سے جو صورتِ حال وجود میں آتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ پورا اسلامی معاشرہ مسلسل ایک مہینے تک ایک منضبط تربیتی کیمپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک ہی فضائے عبودیت ہوتی ہے جو مشرق سے مغرب تک چھائی ہوئی ہوتی ہے، ایک ہی حالتِ ضبط و ریاض ہوتی ہے جو فرد فرد کے چہرے سے نمایاں ہوتی ہے۔ کیا وہ معاشرہ جس پر مسلسل ایک ماہ تک ایسی غیر معمولی یکساں ذہنی فضا اور یکساں ظاہری حالت طاری رہے اور جو پورا کا پورا ایک تربیتی کیمپ بنا ہوا ہو، اس کے افراد کے ذہنوں میں یہ تصور رہ رہ کر نہ ابھرتا رہے گا کہ ہم سب ایک ہی مشن کے علم بردار اور ایک ہی محاذ کے سپاہی ہیں؟

بلاشبہ ایک منفی نوعیت کی عبادت کو بھی اس طرح اجتماعیت کا حامل بنا دینا حُب اجتماعیت کے کمال کی دلیل ہے۔

(۴) حج:

اب چوتھی عبادت حج کو لیجیے۔ حج کی غایت یہ ہے کہ اللہ واحد کا پرستار اور معبودِ برحق کا جاں نثار بندہ اس گھر پر حاضری دے جو توحید کا مرکز ہے، جہاں ہر طرف سچی خدا پرستی کے شعائر فداکاری کا

درس دے رہے ہیں، جو موحدِ اعظم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ایمان واسلام کی ایک مجسم یادگار ہے ـــــــ حاضری اس لیے دے تا کہ اس کے سر کی آنکھیں اور اس کے دل کی نگاہیں، دونوں ہی اس شہادت گہِ اُلفت کا قریب سے مشاہدہ کر لیں، اور وہ جان لے کہ قولِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی عملی تفسیر کیا ہے؟ پھر خدا پرستی کے سے جذبات سچے سرشار ہو کر بندگی کے میدانِ عمل میں ایک نئے جوش کے ساتھ واپس آئے۔

اس عبادت کے ارکان میں سب سے بڑا رکن میدان عرفات کی حاضری ہے۔ یہاں دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مختلف نسلوں، قوموں، زبانوں اور رنگوں کے لاکھوں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان سب کا ایک امیر حج ہوتا ہے، یہ امیر پورے مجمع کو خطاب کرتا ہے، اور اسے ایمان کے حقائق، اسلام کے مطالبات اور بندگی کے آداب کی تلقین کرتا ہے۔ جو شخص اس اجتماع میں حاضر نہ ہو سکا اس کا حج ادا نہ ہو سکے گا، چاہے اس نے باقی مراسم حج کتنے ہی اہتمام سے کیوں نہ ادا کر لیے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کو بھی نمایاں حد تک اجتماعیت کے قالب میں ڈھال دیا گیا اور شعورِ اجتماعیت کا ایک زبردست ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

اگر غور کیجیے تو دوسری عبادتوں کی طرح یہاں بھی دکھائی دے گا کہ حج کی جو اصل غایت ہے اس کا حصول کسی اجتماع کی ضرورت سے یکسر بے نیاز ہے، یہی نہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس کے لیے نا مساعد بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تنہائی کا سکون اور یکسوئی کسی ہنگامۂ اجتماع کے مقابلے میں اس امر کا بہتر موقع فراہم کر سکتی ہے کہ انسان کعبہ اور اطرافِ کعبہ کے شعائر اللہ سے ایمان کی تازگی حاصل کرے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود شریعت کہتی ہے کہ حج اجتماع کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتی ہے کہ اجتماعیت کی دینی اہمیت بتانے اور ذہن نشین کرانے میں دوسری عبادتوں سے وہ کسی طرح پیچھے نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے ان سب سے آگے ہی ہے۔

اسلام نے اپنی عبادتوں میں جن اجتماعی آداب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی ہے ان کی ضروری تفصیل آپ کے سامنے آچکی، اور ان کے اندر ان آداب کی جو اہمیت ہے وہ بھی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اس کے بعد آپ کا اعتراف اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ان عبادتوں میں اجتماعیت کی رُوح جس حد تک اتاردی گئی ہے اس کے آگے کسی اور حد کا وجود، عملی امکان سے باہر ہے۔

یہ ہے اجتماعیت کے نقطۂ نگاہ سے اسلامی تعلیمات کے مختلف شعبوں کا جائزہ۔ اس جائزے کے بعد یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ اسلام میں اجتماعیت کو جو بلند ترین مقام عطا کیا گیا ہے اس کی نظیر کسی اور مذہب میں تو کیا، کسی اور نظام میں بھی نہیں پائی جاسکتی۔

اہمیت کی وجہ

غیر اجتماعی زندگی کے خوف ناک نتیجے

اجتماعیت، اسلام کو کچھ ایسی ہی مطلوب ہے جیسا کہ پانی مچھلی کو مطلوب ہوا کرتا ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو پچھلی بحثوں سے روشنی میں آئی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر اسلام نے اجتماعیت کو ایسی غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے دے رکھی ہے؟ وہ اپنے پیرووں کو جماعتی زندگی بسر کرانے پر اس قدر مُصر کیوں ہے؟ وہ ایک منظم سیاسی نظام کے قیام کو ضروری کیوں ٹھیراتا ہے؟ وہ اس نظام کے سربراہ کی اطاعت کو اللہ و رسولؐ کی اطاعت، اور اس کی نافرمانی کو اللہ و رسولؐ کی نافرمانی کیوں قرار دیتا ہے؟ وہ 'الجماعۃ' سے بالشت بھر بھی علیحدگی اختیار کر لینے والے کی گردن سے اپنا حلقہ کیوں نکال لیتا، اور ملی اتحاد میں شگاف ڈالنے والے پر سے اپنی امان کیوں اٹھا لیتا ہے؟ وہ بیعتِ خلافت سے محروم مر جانے والے کی موت کو جاہلیت کی موت کیوں کہتا ہے؟ ——— اس غور و فکر اور اس تحقیق کی ضرورت بالکل کھلی ہوئی ہے۔ اس طرح کے اہم مسائل میں عام انسانی ذہن صرف ''کیا ہے؟'' کے جواب پر کبھی مطمئن نہیں ہو جایا کرتا۔ اسے اطمینان اسی وقت ہوا کرتا ہے جب وہ یہ بھی جان لے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے یہ حقیقت اگرچہ اپنی جگہ بالکل واضح اور روشن سہی، مگر ذہنوں میں اپنا صحیح مقام پا سکنے کے لیے اس بات کا شدید مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے اسباب و مصالح بھی سامنے آ جائیں۔

اس سلسلے میں اتنی بات تو بالکل صاف اور قطعی سمجھنی چاہیے کہ 'اجتماعیت' اسلام کی غرض و غایت پوری کرنے میں کوئی بڑا ہی خاص حصہ لیتی، اور دین و ایمان کے مفادات کی کوئی اہم ترین خدمت انجام دیتی ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے اتنی غیر معمولی اہمیت ہرگز نہ دیتا۔ اس لیے سوچنے اور معلوم کرنے کی بات دراصل صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کی غرض و غایت پوری کرنے میں

کس طرح حصہ لیتی ہے اور دین و ایمان کے مفادات کی کیا خدمت انجام دیتی ہے؟ اس تحقیق کے لیے جب ہم اسلامی مآخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں جیسا کہ لازماً کرنا ہی چاہیے، تو ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے:

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ. (ابوداؤد)

"جماعت سے چمٹے رہو، کیونکہ بھیڑیا اس بکری کو کھا جاتا ہے جو دور نکل جاتی ہے۔"

اَلشَّيْطَانُ ذِئْبُ الْإِنْسَانِ كَذِئْبِ الْغَنَمِ يَأْخُذُ الشَّاذَّةَ وَالْقَاصِيَةَ وَالنَّاحِيَةَ.

(مسند احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

"شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جس طرح کہ بکریوں کے لیے (یہ معروف) بھیڑیا ہوا کرتا ہے، یہ بھیڑیا اس بکری کو پکڑتا ہے جو الگ جا بھاگتی، یا دُور نکل جاتی یا کسی طرف علیحدہ ہو رہتی ہے۔"

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ أَبْعَدُ. (ترمذی جلد دوم، کتاب الفتن)

"الجماعۃ" کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو، اور پھوٹ کے قریب بھی نہ پھٹکو کیونکہ شیطان اکیلے شخص کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ دو سے بہت دُور ہوتا ہے۔"

یعنی اجتماعی شیرازے سے اپنے کو وابستہ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ایمانی زندگی کی ٹھیک ٹھیک حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اجتماعیت موجود نہ ہو تو مسلمان کے دین و ایمان کی خیر نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس شکل میں وہ گویا شیطان کی کمین گاہ میں ہوتا ہے، جہاں وہ اسے بڑی آسانی سے مار لے سکتا ہے۔ جب کہ ملی اجتماعیت ایسی آہنی پناہ گاہ ہے جس کے اندر گھس آنا اور گھس کر کسی صاحب ایمان کو شکار کر لینا اس کے لیے آسان نہیں رہا کرتا۔

یہ جواب، جو ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہمیں ملتا ہے، اگرچہ مجمل ہے، مگر سوال زیر بحث کے حل کے لیے بالکل کافی ہے۔ کیونکہ اس کا یہ اجمال ایسا نہیں ہے جس کی تفصیل خود ایک مسئلہ بن جاتی ہو، بلکہ ایسا اجمال ہے جس کی وضاحت کے لیے دین کا پورا فلسفہ،

شریعت کا پورا نظام اور ملت کی پوری تاریخ موجود ہے۔اس فلسفے،اس نظام اوراس تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کا نہ ہونا مسلمان کے دین وایمان کو ایک دو نہیں، تین تین جہتوں سے شدید ترین خطرے میں ڈال دیتا ہے:

(ا) ماحول کی باطل نوازی

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اسلامی اجتماعیت سے محروم ماحول غلط افکار، اعمال اور اقدار کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار اور صالح افکار، اعمال اور اقدار کے حق میں بہت کچھ ناسازگار رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے ممکن حدود کے اندر بھی تقویٰ اور دین داری کی راہ چلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک بہت ہی واضح حقیقت ہے، جس کے سلسلے میں نہ کسی شرح کی ضرورت ہے نہ کسی دلیل کی۔ معمولی غور وفکر سے بھی یہ بات سمجھ لی جاسکتی ہے کہ جہاں اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت موجود نہ ہوگی وہاں اسلام کے مطلوبہ افکار و اعمال اور اخلاق و اقدار کے لیے فضا سازگار نہ رہ جائے گی۔ اسلامی اجتماعیت کا مطلب آخر ہے کیا؟ یہی تو نہ کہ ایک ایسا متحد اور منظم معاشرہ قائم ہو جس کی شیرازہ بندی اللہ کی رسی سے ہوئی ہو، جس کی سب سے نمایاں خصوصیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو، جس کا فرد فرد خود ہی بھلا بننے کو کافی نہ سمجھتا ہو بلکہ دوسروں کو بھی بھلا بنانے کی کوشش کرتے رہنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہو، جس کی عام فضا گمراہیوں اور برائیوں کے محرکات سے پاک ہو، جس میں خدا ترسی ہی عزت کا معیار ہو، اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ہی جس کا خاص امتیاز ہو۔ واضح بات ہے کہ ایسے معاشرے میں ایک صاحب احساس مسلمان کے لیے نیک بننا آسان اور برا بننا مشکل ہوگا۔ کہنا چاہیے کہ اس کے لیے مسلمان بن کر رہنا ہموار زمین پر چلنے کے ہم معنی ہوگا۔ حتیٰ کہ جس کی ایمانی اور اخلاقی حس تیسرے درجے کی ہوگی، وہ بھی برائیوں سے فی الجملہ محفوظ ہی رہے گا۔ کیونکہ یہ ماحول اسے برابر نیکیوں کی طرف مائل کرتا اور برائیوں سے نفرت دلاتا رہے گا۔ جس کا نتیجہ فطری طور پر یہی ہوگا کہ اس کے فکر وعمل پر خدا ترسی اور خیر پسندی کا ذوق غالب رہے گا ـــــــ اس کے بالمقابل اسلامی اجتماعیت کی

ناموجودگی کا مطلب ہے ایک ایسا ماحول جہاں مسلمان تو ہوں مگران کا کوئی معاشرہ نہ ہو، اور اگر معاشرہ ہو بھی تو ایسا ہو جس کا نہ کوئی شیرازہ ہو نہ کوئی اجتماعی نظم ہو، اور اگر شیرازہ اور اجتماعی نظم بھی ہو تو وہ قرآنی اور اسلامی نہ ہو۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ماحول صحیح معنوں میں 'معروف' پسند اور 'منکر' بیزار ہرگز نہ ہوگا۔ یہاں اسلامی قدروں کی بالادستی قائم نہ ہوگی۔ یہاں ہر طرف باطل پسندی کے محرکات پھیلے ہوں گے۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر ایک عام مسلمان کے لیے نیک بننا بہت مشکل اور بُرا بننا بہت آسان ہوگا، یہاں اس کے لیے مسلمان بن کر رہنا کسی ہموار زمین پر چلنا نہیں بلکہ کھڑی پہاڑی پر چڑھنا ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی خدا ترسی اور خیر پسندی کے ذوق سے دُور ہوتے رہیں گے۔

(۲) اتباعِ دین کا لازمی نقص

دوسری بات یہ کہ ایسے ماحول اور معاشرے میں مسلمان عملی طور پر ایک خاص حد تک تو اسلام سے لازماً بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی کسی ایسے شخص کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکتی جو یہ جانتا ہو کہ اسلام کیا ہے، اور مسلمان اس زمین پر کس لیے بھیجا گیا ہے؟ دین کے پورے نظام پر ایک نظر دوڑا جائیے تو صاف دکھائی دے گا کہ اسلامی اجتماعیت کے موجود نہ ہونے کی شکل میں مسلمان عملاً ذیل کے متعدد پہلوؤں سے اسلام سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے:

(الف) سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق پوری طرح ادا نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اس کی بندگی کے کتنے ہی اہم ترین مطالبات کو پورا کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہوتا۔ اس کے دین کی شہادت اور اقامت سے زیادہ بڑا اور اہم فریضہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ تو وہ فریضہ ہے جو مسلمان کے وجود کی کل غایت ہے۔ اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب عمل اللہ کی نگاہ میں اور کیا ہوگا، جسے حدیث میں صراحتاً سب سے افضل عمل فرمایا گیا ہے اور جس کے اشتیاق سے خالی رہنے والے سینے کو نفاق کا مریض قرار دیا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی سے محروم رہ کر کیا ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی شکل ممکن بھی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اور بالکل

نہیں۔ اچھا ان امور کو بھی چھوڑیے، اور ان احکامِ دین کو لیجیے جن کے 'عبادت' اور 'حقوق اللہ' ہونے میں الفاظ کی حد تک بھی دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہ نماز، یہ زکوٰۃ اور یہ حج بھی تو اجتماعیت کے بغیر اس معیاری شکل میں ادا نہیں ہوسکتے جس شکل میں اللہ و رسولؐ ان کو ادا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان ساری حقیقتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت تو موجود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق تلف ہونے سے بچ جائیں؟

(ب) یہی حشر بندوں کے حقوق کا بھی ہوتا ہے۔ کسی دکھیارے کی مدد، کسی بے کس کی خبر گیری، کسی مظلوم کی فریاد رسی، کسی مریض کی عیادت، کسی جنازے کی شرکت، غرض عام طور سے ایک مسلمان پر دوسرے بندگانِ خدا کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، اجتماعی زندگی کے بغیر ان کے ادا ہوسکنے کے پورے مواقع کسی طرح باقی نہ رہ جائیں گے، اور اس کی زندگی اس اجتماعیت سے جتنی ہی زیادہ دُور ہوگی اتنے ہی زیادہ یہ مواقع بھی کم ہو رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر یہ دُوری کامل علیحدگی اور تنہائی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو تو یہ مواقع سرے سے ناپید ہو جائیں گے۔

(ج) اخلاقیات کا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہتا۔ دین میں اچھے اخلاق کی جو اہمیت ہے وہ کچھ ڈھکی چھپی نہیں۔ ایک طرح سے گویا وہی حاصلِ دین ہیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے کہ "مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں محاسنِ اخلاق کی تکمیل کر دوں" (بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ، موطا)۔ لیکن اتنی اہم چیز بھی غیر اجتماعی زندگی میں اپنے ظہور کے لیے ترستی رہ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں یہ غیر اجتماعی زندگی اپنی آخری شکل یعنی تنہائی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے وہاں راست بازی، امانت داری، پاک دامنی، حیا، وفائے عہد، رحم، شفقت، خیر خواہی، ایثار، صبر، تحمل، سنجیدگی، نرم خوئی، خوش گفتاری اور فراخ دلی جیسے بے شمار انسانی فضائل، اسلامی اخلاق اور ایمانی اوصاف عملاً مجرد تصورات بن کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا تعلق تمام تر انسانوں کے باہمی روابط اور معاملات سے ہوتا ہے۔ معروف معنوں میں 'اخلاق' کہتے ہی اس رویے کو ہیں جو ایک انسان دوسرے انسان کے، یا ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص

کسی ایسے مقام پر جا رہتا ہو جہاں اس کا کسی اور شخص سے سابقہ ہی نہ پیش آتا ہو تو وہاں وہ آخر کس طرح ان دینی مطالبات پر عمل کر سکے گا؟ اسی طرح جہاں کوئی منظم معاشرہ اور اس کا مکمل اجتماعی نظم ہی موجود نہ ہو وہاں کون سی چیز ہوگی جو مسلمان سے اسلام کی اجتماعی اور بین الاقوامی اخلاقیات کا مظاہرہ کرا سکے گی؟

(د) جہاں تک مسلمان کی عام تمدنی اور سماجی زندگی کا تعلق ہے، اُس پر تو اس صورتِ حال کا بڑا ہی گہرا اور غیر معمولی مخالفانہ اثر پڑتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں اس زندگی کے مختلف شعبوں سے اسلام تو رخصت ہو ہی رہتا ہے ساتھ کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہاں اسلام کی جگہ کفر آ موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک جانی بوجھی بلکہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مسلمان اگر کسی غار میں جا کر گوشہ نشین نہیں ہو گیا ہے، بلکہ انھی بستیوں اور آبادیوں میں رہتا سہتا ہے تو اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لازماً ایک غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزار رہا ہے، اور کسی غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان کی زندگی، کم از کم بڑے اجتماعی معاملات میں تو یقیناً، غیر اسلامی خطوط ہی پر بسر ہو رہی ہے، بلکہ یہ کہنا بھی خلافِ واقعہ نہ ہوگا کہ اس کے شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی حرمت بھی پوری طرح برقرار رہ جانے والی نہیں۔

ان سارے پہلوؤں سے، اور اس حد تک، اسلام سے عملی بے تعلقی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی، نہ اس صورتِ حال کی تعبیر کے لیے ''ایک خاص حد تک اسلام سے بے تعلقی'' اور ''اتباعِ دین کے بھاری نقص'' کے لفظوں کو آپ سخت الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ شارع علیہ السلام نے عورتوں کو ''نَاقِصَاتُ دِیْنٍ'' (ناقص اور ادھورے دین والیاں) فرمایا ہے، وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ:

''جب اسے حیض آتا ہے تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے نہ روزے رکھ سکتی ہے۔''

اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ...... فَذَالِکَ نُقْصَانُ دِیْنِهَا. (بخاری، کتاب الحیض)

غور کیجیے، اگر ہر ماہ چند روز کی یہ حالت، کہ عورت نماز نہیں پڑھ سکتی اور روزے نہیں رکھ سکتی،

اس کے دین کے ناقص ہونے کی دلیل ہے تو پوری پوری زندگیوں کی یہ حالت کہ مسلمان اسلام کے اتنے اہم اور گوناگوں قسم کے احکام پر بالکل عمل نہیں کر سکتے، ان کے دین کا کیا درجہ ٹھیرائے گی؟ خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ عورت کی مذکورہ حالت اس کی ایک طبعی، پیدائشی اور بالکلیہ جبری حالت ہے، جسے پیش نہ آنے دینا، یا پیش آ جانے کے بعد اپنی کوششوں سے ختم کر دینا اس کے اختیار سے قطعی باہر ہے، اور اسی وجہ سے اس کے سلسلے میں اس پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں آتی .... جب کہ اجتماعی زندگی سے الگ یا محروم رہنے والے مسلمانوں کی حالت طبعی اور پیدائشی تو کیا ہوگی، اس طرح کی جبری بھی ہرگز نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات تو اس کے پیدا کرنے یا باقی رکھنے کے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایسی شکل میں کیا یہ ممکن ہے کہ اس حالت کی موجودگی میں ان کے دین کو 'ناقص' نہ کہا جائے؟ اور کیا یہ غلط بات ہوگی کہ انھیں ان احکام دین کی حد تک، جن پر وہ غیر اجتماعی اور غیر منظم زندگی بسر کرنے کے باعث عمل نہیں کر سکتے، دین سے بے تعلق قرار دیا جائے؟ انصاف تو یہ فیصلہ دینے پر مصر ہے کہ ان کے دین کو ناقص ہی نہیں بلکہ 'ناقص تر' قرار دیا جائے، اور انھیں "ایک خاص حد تک دین سے بے تعلق" ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں قابلِ مواخذہ بھی سمجھا جائے۔

(۳) دینی حس کا پیہم زوال

غیر اجتماعی زندگی میں تیسری آفت یہ آتی ہے کہ دینی حس اور ایمانی حمیت پر باطل مسلسل چوٹیں لگاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسے بے جان کر کے رکھ دیتا ہے۔ باطل کو یہ بھرپور موقع اس اقتدار کی بدولت مل جاتا ہے جو اسے اسلامی اجتماعیت سے محروم مسلمانوں پر حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا، اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت اور اجتماعی نظم کے موجود نہ ہونے کے لازمی معنی بالعموم یہی ہوتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی ایک غیر اسلامی نظام کے تحت بسر ہو رہی ہے، یعنی ایک ایسے نظام کے تحت، جس میں زندگی کا عام اجتماعی کاروبار کافرانہ بنیادوں پر چلتا ہو، جس میں انسانی خلافت کا تصور بنیادی طور پر ایک غیر آئینی تصور ہو، جس میں اخلاق کی اجتماعی قدریں

کتابِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ سے نہیں بلکہ کسی اور ہی سرچشمے سے اخذ کی گئی ہوں، جس میں وسیع تر اجتماعی معاملات کے اندر اسلام کو مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کا کوئی حق نہ ہو، جس میں 'معروفات' اور 'منکرات' کے تعین میں شریعت کا فیصلہ کوئی آخری فیصلہ نہ ہو، اور اسلام کے کتنے ہی معروف منکر اور منکر معروف بنا دیے گئے ہوں، جس میں انسانی اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیادیں عدل و انصاف اور تعاون علی البر کے اسلامی اصولوں کے بجائے کسی قوم، کسی نسل، کسی وطن، کسی طبقے یا کسی 'ازم' کے مادی مفادات پر اٹھائی گئی ہوں، جس میں عدالتیں شرعی قوانین ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی مطلق پابند نہ ہوں، حتیٰ کہ جس میں مسلمان اپنے انفرادی معاملات میں بھی اسلامی احکام وضوابط پر عمل کرنے میں پوری طرح آزاد نہ ہوں ـــــ اندازہ لگائیے کہ ایسے نظام اور ماحول میں ایک مسلمان کی نفسیات کا حال کیا ہوگا؟ ابتدا میں کیا رہے گا، اور آگے چل کر کیا ہو جائے گا؟ کوئی شک نہیں کہ اس صورت حال کو دیکھتے ہی اس کی ایمانی خودی تڑپ اٹھے گی، اس کا دَم گھٹنے لگے گا، وہ اپنے کو غلاظت کے گڑھے میں دھنسا ہوا پائے گا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بڑے سے بڑا نفاست پسند بھی اگر کسی گندی اور بدبودار کوٹھری میں بند ہو کر رہ جائے تو بس ایک محدود مدت ہی تک اس پر ناگواری، بے چینی اور کرب کی کیفیت طاری رہے گی۔ پھر وقت جوں جوں گزرتا جائے گا اس کی یہ ناگواری اور بے چینی بھی ہلکی پڑتی جائے گی، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب اس کی قوتِ شامہ وہاں کی عفونت سے مانوس ہو رہے گی، اور اب وہ صرف نظریے کی حد تک اس گندگی اور عفونت کو گھن کھانے کی چیز کہے گا، عملی طور پر اس سے کوئی گھن نہ کھائے گا۔ انسانی نفسیات کا جس شخص نے بھی تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہوگا وہ بالیقین اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا۔ کہنا چاہیے کہ یہ بات علم النفس کے مسلمات میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کے معاملے میں یہ نفسیاتی اصول بدل نہ جائے گا۔ آپ چاہیں تو لاکھوں کے گروہ میں سے کچھ افراد کو مستثنیٰ کر دیں، لیکن تجربے اور مشاہدے کی گواہی بتاتی ہے کہ ننانوے فی صد سے بھی بڑی اکثریت پر قطعاً اسی اصول کا اطلاق ہوگا۔ یعنی ہوگا یہ کہ جس وقت ملت اپنی اجتماعیت کھو کر یا اس کے بند ڈھیلے کر کے

کسی غیر اسلامی نظام کو اپنے اُوپر مسلط کرائے گی اس وقت تو اہل ایمان کو ایسا معلوم ہوگا جیسے بستر انگاروں کا الاؤ بن گئے ہیں۔ جیسے ان کے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، ہر طرف آبلے ڈال دینے والی گیس کے بم پر بم پھٹ رہے ہیں۔ اس صورت حال سے گھبرا کر وہ دُور نکل بھاگنے کے لیے چاروں طرف اپنی پریشان نگاہیں دوڑائیں گے، جوش اضطراب میں ہاتھ پاؤں بھی ہلائیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ جو نظام اور جو اقتدار زندگی کے اجتماعی دروبست پر قابض ہو چکا ہوگا، وہ اس ذہنی بغاوت سے متاثر ہو کر اپنا قبضہ اٹھا لینے سے رہا۔ وہ تو پوری مضبوطی اور عزم کے ساتھ بدستور اپنا سکہ چلاتا رہے گا، اور ملت کے مسلمان ہونے کے باوجود اس پر ان اقدار، ان مصالح، ان افکار، ان نظریات اور ان احکام و قوانین کے تحت حکومت کرتا رہے گا جن کا کہ اس کی نامسلمان فطرت اور اس کی سیاسی مصلحت تقاضا کرے گی۔ آخر کار آنکھیں آہستہ آہستہ اس صورت حال کی عادی ہونے لگیں گی، جذبات کی بے قراری اور ذہنی بغاوت پر تھکاوٹ اور پھر افسردگی طاری ہونے لگے گی، اضطراب، احساسِ غم کی سطح پر آ جائے گا، اور بغاوت کی آگ حسرت کی راکھ میں تبدیل ہو جائے گی۔ پھر یہ دَور بھی ختم ہوگا، اور اب دینی حمیت سے دل خالی ہونے شروع ہوں گے، 'غیر اسلام' سے طبیعتیں مانوس ہونے لگیں گی، ذہنی اور جذباتی لڑائی صلح اور رواداری سے بدلنے لگے گی، اور غیر اسلام سے مسلمان کی کوئی عملی مخالفت باقی نہ رہ جائے گی۔ ہوتے ہوتے چوتھا اور آخری دَور آ جائے گا، جب وہ غیر اسلام خوب بن جائے گا جو کبھی انتہائی ناخوب تھا۔ مسلمان اُس نظام اور اقتدار کو، جو اس کے دین کو دیس نکالا دے چکا ہے یا کم سے کم یہ کہ جس نے اُسے خانہ قید کر رکھا ہے، سلامیاں دے گا، اس کی بارگاہ میں عزت کا طالب ہوگا، اس کی چاکری میں فخر محسوس کرے گا، اس کی خیمہ برداری کا حق حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے گا۔ وہ ''مسلمان'' ہوگا، مگر غیر اسلامی نظام کے خلاف زبان سے بھی کوئی اظہارِ ناگواری نہ کرے گا۔ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اس کے احکام و مرضیات کے تحت ہی وہ اس دنیا کا نظام چلانے کا ذمہ دار ہے، وہی اس کا مقتدرِ اعلیٰ اور اصل قانون ساز ہے، اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، دنیا اور آخرت دونوں کی

فلاح اسی نظام کی پیروی پر موقوف ہے ـــــــــ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے اونچے حقائق 'مذہبی' اجتماعات میں زیب داستان کے طور پر بیان ہوتے رہیں گے۔ مگر دنیا کے وسیع عملی میدان میں ملت اپنی زندگی کی گاڑی اُس 'ازم' کی پٹری پر رواں دواں چلاتی رہے گی جسے ملک کے غیر اسلامی نظام اور کافر اقتدار نے اپنا 'دین' بنا رکھا ہوگا۔ ملت کی موجودہ حالت اس حقیقت کا زندہ ثبوت بنی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہی ہے، جس کے ہوتے ہوئے کسی نظری اور منطقی دلیل کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ واقعات کی اس واضح ترین گواہی کو ہوش کے کانوں سے سنیے اور اندازہ کیجیے کہ باطل اقتدار اور غیر اسلامی نظام، ایمانی حمیت اور دینی حس پر کس طرح کی چوٹیں لگا سکتا ہے، اور چوٹیں لگاتے لگاتے اس پر کیسی سکتے کی، بلکہ موت تک کی حالت طاری کر دیا کرتا ہے۔

اسلامی اجتماعیت سے محروم زندگی جس مسلمان کے دین و ایمان پر ایسے سخت حملے کرتی اور انھیں ایسے عظیم خطرات میں ڈال دیتی ہے، سوچیے بھلا وہ کب تک اور کس حد تک سچا مسلمان باقی رہ سکتا ہے؟ اس لیے ماننا پڑے گا کہ شیطان کی ہزار کوششوں پر اس کی یہ ایک کوشش بھاری ہے کہ مسلمان کو اجتماعی زندگی سے محروم کر دے۔ ایک ایک مسلمان کو اگر وہ الگ الگ شکار کرنا چاہے گا تو اسے اتنے ہی گڑھے کھودنے پڑیں گے جتنے کہ مسلمان ہوں گے۔ لیکن اگر وہ انتشار اور غیر اجتماعی زندگی کا گڑھا کھود لیتا ہے تو یہ اکیلا ایک ہی گڑھا ان کی بھاری اکثریت کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اس لیے اگر 'جماعت' سے الگ یا محروم رہنے والوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کا بے بس اور آسان شکار فرمایا ہے تو یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس سے بہتر تعبیر اس صورت حال کی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

اجتماعی زندگی کے بیش بہا ثمرات

غیر اجتماعی زندگی تو دین و ایمان کے لیے ایسے شدید خطرات پیدا کر دیتی اور مسلمان کو شیطان کا صیدِ زبوں بنا دیتی ہے، مگر اجتماعی زندگی ان کے لیے کیا ثابت ہوتی ہے، یہ جاننے کے لیے ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنیے:

یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ۔ (ترمذی، جلد۲)

''اللہ کا ہاتھ 'جماعت' پر ہوتا ہے۔''

یعنی اجتماعی زندگی ہی وہ زندگی ہے جس میں مسلمان اللہ کی نوازشوں اور نصرتوں کے فی الواقع سزاوار بنتے ہیں۔

اگر یہاں بھی یہ سوال کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو اب یہ ایک غیر ضروری سوال ہوگا۔ کیونکہ غیر اجتماعی زندگی کے عملی نتائج اگر وہ سب کچھ ہیں، جن کا حال ہم ابھی جان چکے ہیں، تو اس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ اجتماعی زندگی کے ثمرات ٹھیک انھی کی ضد ہوں گے۔ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت سے جو معاشرہ بے بہرہ ہوتا ہے وہ اگر غلط افکار واعمال کو پروان چڑھاتا اور صالح افکار واعمال پر خزاں کی کیفیت طاری کر دیا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں مسلمان کے لیے بر وتقویٰ کی راہ دشوار سے دشوار ہوتی جاتی ہے، تو وہ معاشرہ، جو اس اجتماعیت سے بہرہ ور ہوگا، قطعاً ایک مختلف صورتِ حال کو وجود میں لائے گا، صالح افکار واعمال کو پروان چڑھائے گا، باطل افکار و اعمال کو پنپنے سے روکے گا، نیک روی کی ترغیبیں دیتا رہے گا، جس کے نتیجے میں لوگوں کے قدم آپ سے آپ نیکی اور خدا ترسی کی طرف اٹھتے رہیں گے۔ اسی طرح اگر اس معاشرے میں مسلمان اپنے دین کی ناقص پیروی ہی کے لیے مجبور رہتا ہے تو اس میں اسے ایسی کسی کوفت بھری مجبوری سے کوئی سابقہ پیش نہ آئے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اس کے اندر دینی حس اور ایمانی حمیت پر مسلسل ہتھوڑے چل رہے ہوتے ہیں تو اس کے اندر دین وایمان کو ایسی کسی جان لیوا آفت کا سامنا بالکل نہ کرنا پڑے گا۔ مختصر یہ کہ اجتماعی زندگی وہ زندگی ہوتی ہے جس کے اندر مسلمان اپنے مولیٰ کی اطاعت وبندگی کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کر سکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے چاہتا بھی صرف یہی ہے کہ اس کی طاعت اور بندگی کا حق ادا کیا جائے۔ یہی اس کا مطالبہ ہے، اور اسی میں اس کی رضا ہے۔ اس طرح حقیقتِ واقعی یہ قرار پائی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا پورا ہونا صحیح جماعتی زندگی پر موقوف ہے۔ پھر یہ جماعتی زندگی ہی اسے محبوب کیوں نہ ہوگی؟ اور جو زندگی اسے محبوب

ہوگی بدیہی بات ہے کہ اس کی رحمتوں، نوازشوں اور نصرتوں کا رُخ بھی اسی کی طرف ہوگا۔ معلوم ہوا کہ صحیح اجتماعی زندگی ہی میں دین وایمان کو پوری پوری نشو ونما ملتی، اور مسلمان کی دنیوی واُخروی فلاح محفوظ رہتی ہے۔ سوچیے، کتنے بیش قیمت ہیں اجتماعی زندگی کے یہ ثمرات! اور کتنی ضروری ہے اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے یہ اجتماعی زندگی!!

گوشہ نشین بزرگوں کا مسئلہ

اس موقع پر واقعات کی بعض شہادتیں ذہن میں ایک الجھن پیدا کرسکتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسے بھی دُور کرلیا جائے۔

'الجھن' یہ ہوسکتی ہے کہ کتنے ہی بزرگانِ دین ہیں، جن کی زندگیاں اس بات کی تائید نہیں کرتیں۔ اس کے بخلاف وہ اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ جماعتی زندگی سے بالکل کٹ کر بھی بندگی اور خدا پرستی کا اُونچے سے اونچا مقام حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان بزرگوں نے ایسی ہی زندگی گزاری، لیکن اس کے باوجود شیطان ان کی طرف رُخ کرنے کی بھی جرأت نہ کرسکا، چہ جائیکہ انھیں شکار کرلیتا۔

اِس اُلجھن کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی کلیہ ایسا ہوگا جس میں استثنا نہ ہو۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کا یہ نتیجہ نکلا کرتا ہے، تو اس کا مطلب عموماً یہ نہیں ہوا کرتا کہ کبھی اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا، بلکہ ایسا صرف غالب صورت حال کے پیش نظر کہا جاتا ہے، اور کہنے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ عام طور سے ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے جب یہ فرمایا گیا کہ جماعتی زندگی سے علیحدگی اختیار کرنے والے کو شیطان بڑی آسانی سے شکار کرلیتا ہے، تو یہ دراصل بیان حقائق کے اسی معروف اسلوب میں فرمایا گیا، اور مطلب اس کا یہ ہے کہ عموماً ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں واقعات اس امر کی شہادت دینے کو تیار ہیں کہ بعض افراد جماعتی زندگی چھوڑ کر بھی بڑے خدا ترس اور عابد وزاہد ہوگزرے ہیں، وہیں وہ اس حقیقت کی بھی منادی کرتے ہیں کہ ان 'بعض' افراد کے مقابلے میں لاکھوں افراد ایسے ہوئے ہیں جو اس جماعتی زندگی سے محروم ہوکر اپنے

دین کو ضروری حد میں بھی محفوظ نہ رکھ سکے، اور خدا کے مقابلے میں شیطان سے زیادہ قریب ہو رہے۔ اب مجموعی حیثیت سے دیکھیے کہ نفع اور نقصان کا میزانیہ کیا رہا؟ اور جماعتی زندگی کا وجود اور عدم وجود، دونوں اُمتِ مسلمہ کے حق میں اپنی اپنی جگہ کیا ثابت ہوئے؟

جہاں تک دین کے احکام اور ہدایات کا تعلق ہے، وہ عام انسانیت، عام حالات اور عام حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر دیے گئے ہیں، نہ کہ مخصوص حالات اور مستثنیٰ افراد کو سامنے رکھ کر۔ اس لیے اجتماعی زندگی بسر کرنے کا جو حکم اس نے دیا ہے، عام انسانوں کے پیشِ نظر ہی دیا ہے، اور اس سلسلے میں اس نے جو کچھ فرمایا ہے، عام صورتِ حال کو سامنے رکھ ہی فرمایا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب اس نے ایک بات فرما دی ہے تو اب وہ عوام اور خواص سبھی کے لیے واجب التسلیم ہو چکی ہے۔ کیونکہ شریعت کے احکام بلاتفریق سبھی کے لیے ہوتے ہیں، اور کوئی فرد بھی، چاہے وہ کیسے ہی مخصوص رجحانات یا قوتوں کا مالک کیوں نہ ہو، ان کی پیروی کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔

پھر یہ اعتراض یا شبہ اصلاً بھی غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جماعتی زندگی سے کٹ کر بھی لوگوں نے خدا پرستی کے اونچے مقامات حاصل کیے ہیں۔ لیکن یہ بات جماعتی زندگی کی اہمیت اور افادیت کے خلاف کوئی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگ خدا پرستی کے جن اونچے مقامات پر پہنچے تھے، اجتماعی زندگی کے اندر وہ ان سے بھی زیادہ اونچے مقامات پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کے برخلاف امرِ حق یہ ہے کہ اگر صحیح اجتماعی زندگی کی اعانتیں اور برکتیں بھی ان بزرگوں کے شامل حال رہی ہوتیں تو وہ 'اسلامیت' کے اور زیادہ بلند مقاموں پر فائز ہو گئے ہوتے۔ تنہائی کے گوشوں میں وہ زیادہ سے زیادہ فرشتوں کے درجے تک پہنچ سکے ہوں گے، لیکن اسلامی اجتماعیت کے ہنگاموں میں رہ کر وہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہو گزرے ہوتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی سے دُور رہ کر ایک شخص چاہے جو کچھ بھی بن جائے، لیکن معیاری طور پر وہ انسان نہیں بن سکتا جس کے سر پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت کا تاج رکھ کر اس دنیا میں بھیجا تھا، اور جسے فرشتوں کا بھی مسجود بنایا تھا۔

اسلامی اجتماعیت

مقصدِ اجتماع

دنیا کا ہر منظم اجتماع اپنا کوئی نہ کوئی متعین مقصد رکھتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ متعین مقاصد ہی اجتماعیتوں اور تنظیموں کو وجود میں لایا کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی اجتماعیت بجائے خود مطلوب نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کا صرف ذریعہ ہوا کرتی ہے، اور اس کی جو قدر واہمیت بھی ہوتی ہے، اس مقصد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اگر کسی تنظیم سے پیش نظر مقصد کا حاصل ہونا صحیح معنوں میں متوقع ہو، تب تو اسے جو قدر واہمیت بھی دی جائے کم ہے۔ لیکن صورتِ حال اگر یہ نہ ہو تو چاہے یہ تنظیم سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی کیوں نہ ہو، ایک حقیر تنکے کے برابر بھی قیمت نہ پا سکے گی۔

یہ بات اگر دوسری تمام اجتماعیتوں اور تنظیموں کے بارے میں ایک مسلمہ حقیقت ہے تو اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کے سلسلے میں محض ایک خیال بن کر نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے معاملے میں اس بدیہی اور مسلمہ اصولی حقیقت سے اختلاف کیا جا سکے۔ اس لیے عقل کہتی ہے کہ اس نے اپنے پیرووں کو جس اجتماعیت، جس وحدت اور جس تنظیم کی ہدایت فرمائی ہے، اس سے مراد مطلق اجتماعیت، بے قید وحدت اور تنظیم برائے تنظیم ہرگز نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ لازماً ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت، ایک خاص طرز کی وحدت اور ایک بامقصد تنظیم ہی ہوگی، یقیناً کوئی نہ کوئی متعین مقصد ہوگا جس کی خاطر ہی لوگوں کو متحد اور منظم زندگی بسر کرنے کا یہ حکم دیا گیا ہے، نیز یہی مقصد وہ چیز ہوگی جو مسلمانوں کی کسی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ اسلامی اجتماعیت اور تنظیم ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس مقصد کے حاصل ہونے کا واقعی ذریعہ بن سکتی ہو تب تو اسے اسلامی اجتماعیت اور اللہ ورسول کی پسندیدہ تنظیم قرار پانے کا حق ہوگا، اور دینی حیثیت سے وہ اس اہمیت کی مالک ضرور تسلیم کی جائے جس کی نشان دہی پچھلے اور آنے والے صفحات کر

رہے ہیں۔لیکن حقیقت واقعی اگر یہ نہ ہوئی، اور مسلمانوں کا یہ تنظیمی قافلہ اس مقصد کی طرف بڑھتا دکھائی نہ دیا تو اسے اسلامی اجتماعیت کہلانے کا کوئی حق نہ ہوگا، نہ اسے ان احکامِ دین کی پیروی سمجھا جائے گا جو ملی اجتماعیت اور تنظیم کے بارے میں دیے گئے ہیں۔اور اگر خدانخواستہ معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھا ہوا ہو، مسلمانوں کی یہ تنظیم اپنے بنیادی فلسفے اور اپنے فطری مزاج ہی کے اعتبار سے کچھ ایسی واقع ہوئی ہو کہ اس سے الٹی اسلامی اجتماعیت کے اصل مقصد کی راہ رندھتی ہو، اور اس کے ثمرات اس مقصد کے بجائے کسی اور ہی کی متاعِ مطلوب بنتے ہوں، تو یہ اگرچہ 'مسلمانوں' کی تنظیم ہوگی، مگر اسلام کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ ہوگی، اور اس کے بارے میں اس کی خواہش صرف یہ ہوگی کہ اسے توڑ دیا جائے، اس کی موجودہ بنیادیں ڈھادی جائیں، اور اس کی جگہ وہ تنظیم بپا کی جائے جس سے اس کا مقصدِ اجتماع پورا ہوتا ہو۔

وہ مقصد کیا ہے جس کے لیے اسلام نے اپنے پیرووں کو منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کا حکم دیا ہے؟ یہ سوال دراصل یہ سوال ہے کہ خود ان پیروانِ اسلام کا بحیثیت ایک ملت کے، مقصدِ وجود اور فریضۂ منصبی کیا ہے؟ کیونکہ کسی ملت کا مقصدِ وجود یا فریضۂ منصبی ہی وہ چیز ہوتی ہے جس کے لیے وہ 'ملت' بنتی اور ایک متحد و منظّم گروہ کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔اس لیے ملتِ اسلامیہ کا مقصدِ وجود اور فریضۂ منصبی معلوم کر لیجیے، اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کا مقصد واضح ہو جائے گا۔قرآن مجید نے اس سلسلے میں مختلف مواقع پر جو کچھ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ. (بقرہ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بہتر اُمت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے تمام لوگوں پر (حق کے) شاہد ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

(آلِ عمران۔۱۱۰)

''تم ایک بہترین اُمت ہو، جسے دوسرے سارے انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔''

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ............ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ. (شوریٰ:۱۳)

''اس نے تمھارے لیے وہ دین مقرر فرمایا ہے جس کی تلقین اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی (اے محمدؐ!) ہم نے تم پر کی ہے............(اس ہدایت کے ساتھ) کہ تم اس دین کو قائم کرو۔''

یہ تینوں چیزیں——— شہادت حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اور اقامت دین——— دراصل ایک ہی معنی و حقیقت کے ترجمان ہیں، اور ان کا لفظی اختلاف اسی ایک معنی کے تین خاص رخوں کو نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

قرآن حکیم کے ان بیانوں سے بالکل واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ فریضہ یا مقصد جس کے لیے مسلمان اس زمین پر ایک جماعت کی حیثیت سے موجود، اور ایک امت کی حیثیت سے مامور ہیں، اللہ کے دین کی اقامت اور شہادت ہے۔ اس لیے انھی بیانوں سے بالواسطہ یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ اسلامی اجتماعیت کا مقصد اقامت دین، امر بالمعروف اور شہادت حق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی وہ مراد و مطلوب ہے جس کی خاطر مسلمانوں کو ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی اتنی تاکیدی ہدایتیں دی گئی ہیں، اور ان کے اندر اس منظم اجتماعیت کے شعور کو زندہ و بیدار رکھنے کے لیے اتنے غیر معمولی اہتمامات کیے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان کسی اور غرض سے ہرگز جمع نہیں ہو سکتے، کوئی اور مقصد انھیں اکٹھا کرنے کا حق بالکل نہیں رکھتا، کسی اور مہم کی خاطر ان کی تنظیم حرکت میں آ ہی نہیں سکتی۔ جس طرح یہ اسلامی زندگی نہیں بلکہ جاہلی زندگی ہے کہ مسلمان منتشر اور بن سری فوج بنے رہیں، اسی طرح یہ بھی سرتاسر جاہلیت ہی ہے کہ وہ دین حق کی علم برداری کے سوا کسی اور غرض سے متحد و منظم ہوں۔ اس لیے ان کی کوئی اجتماعیت اور تنظیم اس مقصد سے جس قدر متعلق اور قریب ہوگی، بس اسی قدر وہ اسلامی ہوگی، اور جس قدر اس سے دُور اور بے تعلق ہوگی اس قدر وہ لازماً غیر اسلامی ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر اس کی یہ

دُوری اور بے تعلقی بنیادی اور فکری قسم کی ہوئی تو وہ یکسر غیر اسلامی اور خالص جاہلی اجتماعیت ہوگی، وہ اہل ایمان کی کافرانہ تنظیم ہوگی، وہ ایک ایسی جماعت ہوگی جس کے اُوپر خدا کا ہاتھ ہرگز نہ ہوگا۔

شیرازۂ اجتماع

اسلامی اجتماعیت کے مقصد کا یہ تعین اس کے شیرازے کا بھی تعین کر دیتا ہے۔ اگر اس اجتماعیت کا مقصدِ وحید صرف اللہ کے دین کی اقامت اور شہادت ہے، تو یہ اس بات کا بھی فیصلہ ہے کہ اجتماع کا مرکز صرف یہی دین اور صرف یہ دین ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو ایک متحد و منظم گروہ بن کر رہنے کی ہدایت دیتے وقت جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران:۱۰۳)

’’تم سب مل کر ’اللہ کی رسی‘ کو مضبوطی سے پکڑلو، اور ٹولیوں میں نہ بٹو‘‘

یہ ارشادِ ربانی جس طرح اس باب میں بالکل صریح ہے کہ سارے مسلمانوں کو باہم جڑا ہوا رہنا چاہیے، اسی طرح اس بارے میں بھی کچھ کم صریح نہیں ہے کہ ان کو جوڑنے والی چیز صرف اللہ کی رسی ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن نے اہلِ ایمان کو جس متحد و منظم اجتماعیت کا حکم دیا تھا اس کے لیے ناگزیر ٹھیرایا تھا کہ اس کی ہر اکائی اپنے ’کل‘ سے صرف اللہ کی کتاب کے رشتے سے، اور محض اس کے دین کی خاطر آ کر ملی اور جڑی ہو۔ اس کے سوا اس ’کل‘ کو ’کل‘ بنانے والا اور اس کے اجزا کو آپس میں جوڑنے والا کوئی اور رشتہ نہ ہو۔

ہدایت الٰہی کے اس متن کی شرح معلوم کرنا چاہیں تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل دیکھیں۔ یہ عمل، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر جانتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ آپؐ نے لوگوں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا، آخرت یاد دلائی، اور ایک خدا کی بندگی کی دعوت دی۔ پوری زندگی یہی کرتے رہے۔ جو اس دعوت کو مان لیتا وہ اسلامی جماعت واجتماعیت کا رکن بن جاتا، خواہ اس کی نسلیت، اس کی وطنیت، اس کی رنگت اور اس کی زبان کچھ بھی ہوتی۔ اور جو اسے نہ مانتا وہ اس جماعت کے قریب بھی نہ پھٹک پاتا، چاہے وہ قریشی اور ہاشمی ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس طرح اس دعوت کے سوا

اور کوئی چیز نہ تھی، جس کی طرف آپؐ نے کبھی کسی کو بلایا ہو، اسی طرح اس رشتے کے سوا اور کوئی رشتہ بھی نہ تھا جس کے ذریعے سے کسی کو امت مسلمہ سے اُجڑنے کی آپؐ نے کوئی گنجائش رکھی ہو۔ ایسی کسی گنجائش کا کیا سوال، آپؐ نے تو اس طرح کی اجتماعیتوں اور جتھابندیوں کے خلاف انتہائی سخت الفاظ کہے ہیں۔ چنانچہ 'الجماعۃ' یعنی صحیح اسلامی اجتماعیت سے پوری طرح وابستہ رہنے کی تلقین کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثٰى جَهَنَّمَ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ. (احمد و ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الامارۃ)

''اور جس نے جاہلیت کی پکار پر لوگوں کو بلایا اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اگرچہ روزے رکھتا، نمازیں پڑھتا، اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔''

'جاہلیت' کے معنی ہیں اسلام کی ضد۔ یہ اتنی ہی واضح حقیقت ہے جتنی یہ بات کہ شرک، توحید کی ضد ہے۔ اس لیے ہر وہ پکار جاہلیت کی پکار ہوگی جو اسلامی نہ ہو، جس کو قرآن حق کی پکار تسلیم نہ کرتا ہو، جسے رسولؐ خدا کی زبان سے کبھی بلند ہوتے نہ سنا گیا ہو، اور جسے اللہ کے دین میں جواز کی سند حاصل نہ ہو۔ اسلام نے ایک منظّم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے، اور غیر جماعتی زندگی سے سخت بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص لوگوں کو اس اجتماعی نظم سے آزادی اختیار کر لینے کی طرف بلاتا ہے تو یہ ایک کھلا ہوا جاہلی بلاوا ہوگا۔ اسی طرح قرآن نے تمام مسلمانوں کو اللہ کی رسی کے شیرازے سے منسلک ہو رہنے کی وصیت فرمائی ہے۔ لہٰذا اگر اس کے بجائے کسی اور رشتے کو مرکز بنا کر انھیں اکٹھے ہونے کی دعوت دی جائے گی تو یہ قطعاً ایک جاہلی دعوت ہوگی، خواہ وہ خون کا، وطن کا، زبان کا، رنگ کا، غرض کوئی سا بھی رشتہ ہو۔ اس لیے حدیثِ رسولؐ میں جو دہشت بھری تنبیہ فرمائی گئی ہے، قدرتی طور پر اس کا دائرۂ اطلاق بہت وسیع ہے، اتنا ہی وسیع جتنا کہ 'جاہلیت' کا دائرہ وسیع ہے۔ اور اس دائرے میں جہاں دوسری چیزیں داخل ہیں وہاں یہ بات بھی داخل ہی ہے، اور شاید سب سے نمایاں طور پر داخل ہے کہ مسلمانوں کو

کسی ایسے 'کلمے' پر جمع ہونے کی، کسی ایسے رشتے سے آبندھنے کی، اور کسی ایسے مرکز پر اکٹھے ہو جانے کی دعوت دی جائے جو اسلامی نہ ہو، یعنی اسلام نے اسے نوعِ انسانی کے درمیان امتیاز کی کوئی بنیادی اور حقیقی وجہ نہ تسلیم کیا ہو۔

ایک اور موقع پر اس حقیقت کے سمجھانے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰى عَصَبِيَّةٍ. (ابوداؤد، کتاب الادب)

''نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے لوگوں کو کسی عصبیت کی طرف بلایا۔''

کسی عصبیت کی طرف بلایا، یعنی اسلام کی خالص عقلی اور اعتقادی بنائے اجتماع کو چھوڑ کر مسلمانوں کو اُن نسلی یا وطنی، لسانی یا کونی تعصّبات میں سے کسی تعصب پر جمع کرنے کی کوشش کی جن پر خدا فراموش اور مادّیت کی غلام قومیں بالعموم جمع ہوا کرتی ہیں۔

یہ ارشادِ نبویؐ بھی اس امر کی واضح شہادت ہے کہ اسلام اور کسی عصبیت کی طرف دعوت، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔

غرض 'جاہلی پکار' اور 'عصبیتی دعوت' ایک نجاست ہے، اور اسلام کا ذوقِ لطیف اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جب بھی کبھی ایسا ہوا کہ اغوائے شیطانی کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے اس طرح کی کوئی بات نکل گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فوری نوٹس لیا، اور ذہنوں کو اس گندگی کے اثرات سے پاک کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر ایک مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہوگیا۔ مہاجر نے انصاری کی پشت پر لات ماردی۔ انصاری نے ''يَا لِلْاَنْصَارِ '' (دوڑو اے انصار!) کی صدائے فریاد بلند کی۔ جواب میں مہاجر نے بھی ''يَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ'' (پہنچو اے مہاجرو!) کا نعرہ لگایا۔ آپؐ کے کانوں تک یہ الفاظ پہنچے تو فرمایا:

مَا بَالُ دَعْوَى جَاهِلِيَّةٍ؟ دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ. (بخاری جلد دوم، کتاب التفسیر)

''یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی؟ دُور رہو اس سے، کیونکہ یہ بڑی گندی چیز ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''یَالَلْاَنْصَارَ'' اور ''یَا لِلْمُھَاجِرِیْنَ'' کے الفاظ، جو دراصل نسلی اور وطنی نعرے تھے، صرف ایک وقتی جھگڑے کے سلسلے میں زبانوں سے اچانک نکل آئے تھے۔ کسی سوچے سمجھے فلسفے اور نظریے کے تحت کسی مستقل جماعت سازی کی دعوت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی رسولؐ خدا کو یہ الفاظ اتنے ناگوار گزرے گویا یہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ غلاظت کے کیڑے اور عفونت کے بھبکے ہیں، جنھیں کسی مسلمان کے منہ سے ہرگز نہ نکلنا چاہیے اور جنھیں ایمانی ذوق کی پاکیزگی ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اگر ''جاہلیت'' اور ''عصبیت'' کی طرف بلانے والے کا وجود اسلامی معاشرے کے لیے بالکل ہیچ ہے اور وہ جہنم کا ایندھن ہے تو وہ شخص بھی، جو اس بلاوے پر لبیک کہتا ہے، ملت کا سرمایہ اور جنت کا مہمان نہیں بن سکتا۔ عقل اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی بھی وہی حقیقت ہو جو اس جاہلیت اور عصبیت کے داعی کی بتائی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ''لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّۃٍ'' فرمایا ہے، وہیں اس فیصلے کا بھی اعلان کر دیا ہے کہ:

وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِیَّۃً وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰی عَصَبِیَّۃٍ۔

''اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کے تحت جنگ کی، اور نہیں ہے وہ ہم میں سے جس نے کسی عصبیت کی خاطر جان دی۔''

غرض دین کے سوا، دنیا کا کوئی تعلق، کوئی اشتراک اور کوئی رشتہ ایسا نہیں جس پر مسلمان بحیثیت مسلمان اکٹھے ہو سکتے ہوں، اور جو اسلامی اجتماعیت کا شیرازہ بن سکتا ہو۔ ایسی کسی چیز پر اگر مسلمان اکٹھے ہوں تو اس اجتماع کو جو چاہیے کہہ لیجیے، لیکن اسلامی اجتماع ہرگز نہ کہہ سکیں گے۔ مذکورۂ بالا نصوص سے یہ حقیقت آئینہ کی طرح صاف ہو جاتی ہے۔

طریق اجتماع

اب اس بحث کا صرف ایک گوشہ اور باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ عملاً یہ اجتماعیت وجود میں کس طرح آتی ہے؟ ویسے تو گزشتہ دونوں امور کی وضاحت کے بعد اس سوال کا جواب معلوم

کر لینے کے لیے قیاس اور اندازہ بھی بالکل کافی ہے، مگر مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر مناسب یہی ہوگا کہ اس بارے میں بھی دین کی صریح ہدایتوں ہی پر اپنے اطمینان کی بنیاد رکھی جائے، نہ کہ صرف قیاس اور اندازے پر۔ اس غرض کے لیے جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ اس نے سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں کو ایک منظم اجتماعی زندگی بسر کرنے کی جو جامع ہدایت دی ہے اس کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

(آلِ عمران: ۱۰۲)

"اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو، اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم اللہ کے اطاعت گزار ہو۔"

اس کے بعد "اور" کہہ کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی وہ بات فرمائی گئی ہے جس کا حوالہ پچھلی بحث میں ابھی گزر چکا ہے۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہوا کہ ان لفظوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس ہدایت کی پہلی شق ہے، اور بعد کے لفظوں میں اس کی جو دوسری شق ارشاد ہوئی ہے اس کا وجود اسی پہلی کے وجود پر منحصر ہے۔ یعنی جس طرح اسلامی اجتماعیت ظہور میں نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کا دین ہی اس کا شیرازہ نہ ہو، اسی طرح دین مسلمانوں کی اجتماعیت کا شیرازہ ہرگز نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ فی الواقع ایمان والے نہ ہوں، تقویٰ ان کے سینوں میں گھر نہ کیے ہوئے ہو، اور اسلام (اللہ کی اطاعت گزاری) میں وہ سرگرم عمل نہ ہوں۔ اس اجتماعیت کا جز بننے، جز بنانے اور جز باقی رہنے کی یہ، اور صرف یہی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اس جماعت کا رکن بننے کا اہل نہیں ہوسکتا، نہ اسے اس کا رکن بنایا جا سکتا ہے۔ جس شخص کے اندر یہ صفتیں جتنی ہی پختہ ہوں گی وہ اس جماعت کا اتنا ہی اچھا اور قابل اعتماد جز ہوگا اور اسی قدر زیادہ صحیح طریقے سے اس کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ اور جو ان باتوں میں جتنا ہی خام ہوگا جماعت کے ساتھ اس کی وابستگی بھی اتنی ہی ناپائدار اور ناقابل اعتماد ہوگی۔

پھر اس امر واقعی کا تقاضا جس طرح یہ ہے کہ صرف انھی لوگوں کو اس جماعت کا رکن مانا

جائے جو اللہ کے دین پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی پیروی کا عہد کریں، اسی طرح اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے رکن بن چکے ہوں ان کے اندر ان صفات کے پروان چڑھانے اور پروان چڑھاتے رہنے کا پورا پورا اہتمام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی جس ہدایت کا ہم اس وقت جائزہ لے رہے ہیں وہ صرف اتنے ہی لفظوں پر ختم نہیں ہوگئی ہے جن کے حوالے اوپر آچکے ہیں، بلکہ آگے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

(آل عمران: ۱۰۴)

''اور چاہیے کہ تم وہ گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلاتا، نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا رہے۔''

یہ دراصل اس ہدایت کی تیسری اور آخری شق ہے، جو ایک پہلو سے پہلی شق کا تکملہ بھی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ 'حبل اللہ' کے مرکز پر اکٹھے ہونے سے اہلِ ایمان کی جو جماعت وجود میں آئے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرے کے باہر بھی اور اس کے اندر بھی 'خیر کی دعوت' دیتی رہے، معروف کا امر کرتی رہے، اور جہاں بھی ایمان، اسلام اور تقویٰ کے تقاضوں کو پامال ہوتے دیکھے، روک بن کر سامنے کھڑی ہو جائے۔ صرف اسی شکل میں اس بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس جماعت کے افراد اُن صفتوں کے فی الواقع حامل باقی رہیں گے جن کا پایا جانا اس جماعت کی رکنیت کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں سے ایک فرض 'تزکیہ' بھی تھا، اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح اس بات کے ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دیں اور جو افراد اسے قبول کرلیں انھیں اللہ کی آیتیں سنائیں 'کتاب (احکامِ الٰہی) کی تعلیم دیں، اور 'حکمت' (روحِ دین) سکھائیں (يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) اسی طرح اس بات کے بھی ذمہ دار بنائے گئے تھے کہ اس دعوت کے قبول کرلینے والوں کے علم اور عمل اور اخلاق میں جو خامیاں پائیں ان کی اصلاح کرتے رہیں (وَيُزَكِّيْهِمْ، بقرہ:۱۲۹)۔ جو کچھ آپؐ کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا، ممکن نہیں کہ آپؐ کا عمل ذرہ برابر بھی اس سے مختلف ہوتا۔ چنانچہ تاریخ کی پیشانی پر ہر شخص اس ابھری ہوئی

حقیقت کو نمایاں دیکھ رہا ہے کہ امت مسلمہ کی تشکیل کے سلسلے میں آپؐ نہ تو اس سے کم کسی بات پر راضی ہوئے، نہ اس سے زیادہ کسی چیز کے طالب بنے۔ آپؐ اللہ کے بندوں کو اسی کی بندگی کی طرف بلاتے۔ جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے صرف انھی کو امت کا جز بناتے۔ اور جن لوگوں کو امت کا جز بنا چکتے انھیں اپنے دامن تربیت میں لے لیتے۔ یعنی ان کے اندر ایمان، اسلام اور تقویٰ کا جوہر پروان چڑھاتے رہتے۔ یہی سب کا سب وہ کارِ نبوت تھا جس کے نتیجے میں اسلامی اجتماعیت اور اُمتِ مسلمہ وجود میں آسکی۔

اسلامی اجتماعیت کی ہیئتِ کاملہ

(ریاستی نظام)

حکومتی نظام کی ناگزیر ضرورت

اجتماعیت کا نقطۂ کمال اور اس کی آخری منزل ایک حکومتی نظام کا قیام ہے۔ یہ نظام بجائے خود تو مطلوب نہیں ہوتا، لیکن عملی طور پر انسانی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت بہر حال ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد اپنی فطری طلب کی بنا پر اور اپنی فطری ضرورت کے تحت ایک ساتھ اکٹھے ہو کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ اجتماعی گزر بسر کچھ ایسے مسائل بھی پیدا کر دیتا ہے جن کا حل ضروری ہوتا ہے، اتنا ہی ضروری جتنا کہ بچے کے لیے ماں کی گود اور باپ کا سایہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مسائل ایک طرف تو مستقلاً موجود رہتے ہیں، دوسری طرف انتہائی اہم بھی ہوتے ہیں۔ مستقلاً موجود اس لیے رہتے ہیں کہ ان کا سرچشمہ کہیں خارج میں نہیں ہوتا کہ وہ کبھی پیدا ہوں تو کبھی پیدا نہ بھی ہوں، بلکہ انسان کے اپنے اندرون ہی میں ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس کی اپنی جبلت ہی ہوتی ہے جو انھیں جنم دیتی ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنی جبلت سے بلند اور آزاد نہیں ہو جاتا، جو کم از کم ننانوے فی صد افراد کی حد تک تو قطعاً ناممکن ہے، یہ مسائل لازماً پیدا ہوں گے، اور مستقلاً موجود رہیں گے۔ 'انتہائی اہم' اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اجتماعیت کی غایت ہی فوت ہو جاتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اس کے عملی نتائج بالکل الٹے نکلنے لگتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے اندر جہاں خیر کی قوتیں موجود ہیں، وہیں پہلو بہ پہلو شر کی قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ نوعِ انسانی کے کردار کی پوری تاریخ اسی بات کی گواہی دیتی ہے، اور قرآن حکیم کا صاف و صریح اعلان بھی یہی ہے، جس نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں تقویٰ اور فجور، دونوں کا

الہام کررکھا ہے (فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا)۔ اس امر واقعی کی موجودگی میں اور اپنی اس جبلت کے ساتھ جب بہت سے انسان اکٹھے ہو کر رہیں گے تو یقیناً وہی کچھ ہوگا جس کا ہم ہر لمحہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرف اگر دوسروں کے ساتھ انصاف پسندی، خیر خواہی، ہمدردی اور ایثار کے رویے اختیار کیے جا رہے ہوں گے تو دوسری طرف افراد کی خواہشوں میں ٹکراؤ بھی ہوگا، مفادات میں کش مکش برپا ہوگی، خود غرضیوں کا زور ہوگا، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے خلاف زیادتیاں ہوں گی، حقوق پر ڈاکے پڑیں گے، اور جان و مال، عزت و آبرو، کسی چیز کی امان باقی نہ رہ جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اجتماعیت کو انسان نے اپنے دل کا سکون جان کر اور اپنی جائے پناہ سمجھ کر اپنایا ہوگا وہ اس کے لیے جان کا عذاب ثابت ہوگی۔ ایسی حالت میں اس کے لیے منطقی طور پر دو ہی چارۂ کار ہو سکتے ہیں:

یا تو وہ اس اجتماعیت ہی سے توبہ کر لے۔

یا پھر ان مشکلات کا کوئی حل ڈھونڈے۔

پہلی راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نہ تو اس کے فطری جذبات ہی اس کی اجازت دیں گے، نہ اس کی معاشی اور دفاعی مصلحتیں ہی اسے ایسا کرنے دیں گی۔ اس لیے عملاً اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ اس کے پاس ان مستقل اور انتہائی اہم مسائل کا کوئی مستقل اور مؤثر حل بھی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوئی ایسا انتظام ہو جو خواہشوں کے ٹکراؤ اور مفادوں کی کش مکش کو قابو میں رکھے، کوئی ایسی طاقت ہو جو ظلم پر آمادہ ہاتھوں کو پکڑ لے، کمزوروں کو محفوظ رکھے، مظلوموں کی فریاد رسی کرے، اور حقوق واپس دلائے۔ بغیر کسی بحث اور دلیل کے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت اسی انتظام اور اسی طاقت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہ صرف حکومتی نظام ہی ہے جو کسی اجتماع کے اندر امن و انصاف کی فضا قائم کر سکتا اور برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہ ایک صاف اور فطری حقیقت ہے، اور اس کا انکار اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ انسانی جبلت کے روشن ترین حقائق کی طرف سے آنکھیں نہ بند کر لی جائیں۔ ابن خلدون نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا جب

یہ کہا تھا کہ انسان جس طرح فطری طور پر اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے اسی طرح عین اپنی فطرت ہی کی بنا پر ایک ایسے ''وازع'' اور ''حاکم'' کا ضرورت مند بھی ہے جو اجتماع کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے خلاف دست درازیاں کرنے سے روکے۔

پھر یہ حکومتی نظام کسی اجتماع اور معاشرے کی صرف داخلی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کی خارجی ضرورت بھی ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے وجود اور اپنے مفادات کی ٹھیک ٹھیک حفاظت بالکل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ انسانی جبلت کی کمزوریاں جس طرح ایک اجتماعی وحدت کے افراد کو ایک دوسرے کے خلاف آمادۂ ظلم کرتی رہتی ہیں، اسی طرح مختلف اجتماعی وحدتوں اور قوموں کو بھی آپس میں ٹکرایا کرتی ہیں، اور کوئی قوم اپنے خلاف جارحانہ اقدامات کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کے لیے اپنے دفاع کا انتظام رکھنا اس کا سب سے پہلا نہیں تو ایک اہم ترین فریضہ ضرور ہی ہوگا۔ یہ تو صحیح ہے کہ ضرورت پڑ جانے پر دفاع کا یہ فرض اس اجتماع کے افراد ہی انجام دیں گے، لیکن اگر اس سلسلے میں انھیں اپنی اپنی رائے اور اپنے اپنے انفرادی فیصلوں پر چھوڑ دیا گیا کہ جو شخص جب چاہے اور جس طرح مناسب سمجھے اپنے اس فرض کو انجام دے، تو کامیابی کی توقع رکھنا عبث ہی ہوگا۔ کسی بن سری فوج نے آج تک کسی منظم حملے کا مقابلہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے افراد اپنی اپنی جگہ چاہے کتنے ہی فرض شناس، باحمیت اور جاں فروش کیوں نہ ہوں، اگر وہ کسی نظامِ امر و طاعت کے تحت نہ ہوں گے تو ہونے والے حملوں کا مؤثر دفاع ہرگز نہ کرسکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں گویا حقیقت وہی نکلی کہ ہر اجتماع اپنے دفاع کے لیے ایک حکومتی نظم و نسق کا محتاج ہے۔ یاد ہوگا کہ یہ دفاعی مصلحت اور ضرورت بھی انھی بنیادی اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کے لیے اجتماعیت کو لازم ٹھیراتے ہیں۔ اس لیے اس احتیاج کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت کا قیام خود اجتماعیت کے اپنے مقصدِ وجود کی خاطر بھی ضروری ہے۔

اسلام اور نظامِ حکومت

مسلم معاشرہ بھی انسانی معاشرہ ہی ہوتا ہے، اور انھی انسانوں سے بنتا ہے جن کے اندر خیر

اور شر دونوں کی قوتیں کام کیا کرتی ہیں، اور جن کے دلوں میں فجور اور تقویٰ دونوں ہی کا ''الہام'' فرمایا گیا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ شر اور فجور کے اثر سے بالکل پاک رہے۔ کیونکہ اپنی تمام تر خیر پسندیوں اور تقویٰ شعاریوں کے باوجود مسلمان بھی انسان ہی رہتے ہیں، مافوق الانسان نہیں ہو جاتے۔ اس لیے ان کے معاشرے میں بھی انسانی جبلت کی کمزوریاں ہمیشہ پائی جاسکتی ہیں، ہمیشہ پائی گئی ہیں، اور ہمیشہ پائی جاتی رہیں گی۔ اسلامی شریعت میں حدود اور تعزیرات کی جو ایک طویل فہرست موجود ہے اور فصل مقدمات کے بارے میں جو مفصل ہدایتیں پائی جاتی ہیں وہ اس بات کی ناطق دلیل ہیں کہ خود اسلام بھی اپنے پیروؤں کے بارے میں یہ تصور نہیں رکھتا کہ بدی اور ظلم کا ان کے قریب سے گزر نہ ہوگا، اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں گے۔ بلکہ وہ انھیں ٹھیک وہی انسان سمجھتا ہے جس کی جبلت خیر کے ساتھ ساتھ شر سے بھی وابستگی رکھتی ہے، اور جس سے ہمیشہ ہر غلطی صادر ہو سکتی ہے۔ اس لیے جس طرح دوسرے معاشروں کو حکومتی ادارے اور نظام کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ اپنے افراد کے درمیان امن و انصاف قائم رکھ سکیں، ٹھیک اسی طرح یہ اسلامی معاشرہ بھی اس نظام سے بے نیاز نہ رہ سکے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کرے گا۔ کیونکہ انسان کے جانی اور مالی حقوق کو جو اہمیت اور حرمت اسلام نے عطا کر رکھی ہے، وہ کہیں اور شاید ہی پائی جاتی ہوگی۔

اب جہاں تک دفاعی ضرورت کا تعلق ہے، مسلم معاشرے کو یہ ضرورت بھی ٹھیک اسی طرح لاحق رہے گی جس طرح کہ کسی اور معاشرے کو ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں جب تک 'غیر اسلام' باقی ہے، مسلم معاشرے کے خلاف اقدامات کا اندیشہ ہر آن لگا رہے گا، اور رہ رہ کر عملی صورت بھی اختیار کرتا رہے گا۔ اس لیے اسے اپنی مؤثر حفاظت اور کامیاب مدافعت کے لیے بھی ایک حکومتی ادارے کا قائم رکھنا ازبس ضروری ہے۔

غرض جس پہلو سے دیکھیے، یہ معاشرہ بھی ایک حکومتی ادارے کی ضرورت میں کسی سے کم نہیں ہے، اور اس کا قیام اس کی بھی ایک فطری طلب اور ناگزیر ضرورت ہی ہے۔

نظامِ خلافت کا شرعی وجوب

اس بحث سے مسلم معاشرے کے لیے ایک حکومتی ادارے کی ضرورت اگرچہ پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تمام تر عقلی اور فکری ہے، حالانکہ گفتگو کسی انسانی نظامِ فکر کے بارے میں نہیں بلکہ دینی اور اسلامی تصورات کے بارے میں ہو رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سلسلے میں شریعت کی اپنی وضاحت بھی معلوم کر لی جائے، اور فیصلہ کا اصل انحصار اسی پر رکھا جائے۔ ورنہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے خود اسلام نے مسلم معاشرے کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا ہو جسے بنیاد بنا کر اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی ہے۔

اس غرض سے جب آپ شریعت کی طرف رجوع کریں گے تو پائیں گے کہ ایک حکومتی ادارے کے قیام کے متعلق قرآن اور حدیث کی ہدایتیں، اسوۂ رسولؐ اور اسوۂ صحابہ کی شہادتیں، اور علمائے اسلام کی صراحتیں، سب کچھ موجود ہیں:

(۱) جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے، اس کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے مسلمانوں کو اپنے 'اولی الامر' یعنی امرا و حکام کی اطاعت کا حکم دے رکھا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء:۵۹)

دوسری طرف ان پر ایسے بہت سے قوانین کے نفاذ کی ذمہ داری ڈال رکھی ہے جن کو ایک حکومتی ادارے کے بغیر نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً قاتل کو موت کی سزا دینا، چور کا ہاتھ کاٹ لینا، زانی کو سنگسار کرنا یا تازیانے لگانا وغیرہ۔ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اس امرِ واقعی کا اعلان ہیں کہ قرآن کے نزدیک مسلم معاشرہ قطعی طور پر ایک باحکومت معاشرہ ہے، وہ ایک حکومتی نظام کے تصور کے بغیر مسلم معاشرے کا کوئی تصور نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ رکھنا نہیں چاہتا۔ بلاشبہ وہ اس طرح کے الفاظ تو نہیں استعمال کرتا کہ اے اہل ایمان! تم اپنا ایک حکومتی نظام قائم کرو اور قائم رکھو۔ مگر اس کی وجہ اس ایک بات کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایسا کرنا بالکل غیر ضروری تھا۔ ایک بجائے خود واضح اور طے شدہ حقیقت کے بارے میں خواہ مخواہ کا اعلان و اظہار تھا۔ آخر جہاں دھوپ اور

تمازت کی باتیں ہو رہی ہوں وہاں سورج کے وجود کی صراحت کا کیا سوال باقی رہ جاتا ہے؟ مسلمانوں سے اپنے امراو حکام کی اطاعت کا مطالبہ کرنا اور انھیں مجرموں کے خلاف ایک حکومت کے سے اقدامات کا ذمہ دار ٹھیرانا اپنی جگہ اس بات کی خود ہی سب سے بڑی صراحت ہے کہ وہ ایک حکومتی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہی ہیں، یا یہ کہ انھیں ایسا ہونا ہی چاہیے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ ان آیتوں میں سے جن میں مسلمانوں پر ایک حکومت کے سے اقدامات کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، ایک آیت: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا۔ (المائدہ:۳۸) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

احتج المتكلمون بهذه الاية فی انّه' يجب علی الامة ان ينصبوا لانفسهم اماما معينا والدليل عليه انه تعالٰی اوجب بهذه الآية اقامة الحد علی السراق و الزناة فلابد من شخص يكون مخاطبا بهذا الخطاب و اجمعت الامة علٰی انه فيس لآحاد الرعية اقامة الحدود علٰی الجناة بل اجمعوا علٰی انه لا يجوز اقامة الحدود علی الاحرار الجناة الا للامام، فلما كان هذا التكليف تكليفا جازما ولم يمكن الخروج عن عهدة هذا التكليف الا عند وجود الامام وما لا يتاتی الواجب الابه و كانَ مقدور المكلف فهوواجب فلزم القطع بوجوب نصب الامام حينئذ.

(تفسیر کبیر، جلد۳، صفحہ ۴۱۵)

''علمائے متکلمین نے اس آیت کو اس بات کا ثبوت قرار دیا ہے کہ امت کے لیے اپنا ایک متعین امام (حکمران) مقرر کر لینا واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے سے چوروں اور زانیوں پر حد جاری کرنا واجب ٹھیرایا ہے۔ اس لیے ایک ایسے شخص کا ہونا ضروری ہے جو اس فرمانِ خداوندی کا راست مخاطب (اور اس کی تعمیل کا ذمہ دار) ہو۔ ادھر امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عام افراد و اشخاص کو مجرموں پر حدیں جاری کر دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک آزاد مجرموں کا تعلق ہے،

ان پر حد جاری کرنے کے بارے میں تو اس بات پر اجماع ہے کہ امام کے سوا اور کسی کے لیے وہ قطعاً جائز ہی نہیں۔ اب جب کہ حدیں جاری کرنے کی ذمہ داری ایک قطعی اور لازمی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ایک امام کے بغیر ممکن ہی نہیں، اور یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ جس شے پر کسی امرِ واجب کی تعمیل منحصر ہو اور وہ حدِ استطاعت سے باہر بھی ہو، وہ خود بھی واجب ہو جاتی ہے ——— تو ایسی حالت میں امام کے تقرر کا واجب ہونا بالکل قطعی ہو جاتا ہے۔''

(۲) اب رہا احادیث کا معاملہ، تو اس طرح کی متعدد حدیثیں کتاب کے پہلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں جو مسلم معاشرے کے لیے ایک حکومتی نظام کی ضرورت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یاد تازہ کرنے کے لیے ان میں سے دو خاص حدیثوں پر پھر سے نظر ڈال لیجیے:

(الف) مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم جلد دوم۔ صفحہ ۱۲۸)

''جو کوئی اس حال میں مر گیا ہو کہ اس کی گردن (خلیفۃ المسلمین کی) بیعت (کے قلادے) سے خالی ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

(ب) اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، صفحہ ۳۲۱)

''میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی کا، سمع (احکام سننے) کا، اطاعت (احکام ماننے کا)، ہجرت کا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔''

ایک حکومتی ادارے کی ضرورت کے بارے میں پہلی حدیث کا انداز کچھ اسی قسم کا ہے جیسا کہ قرآن مجید کا ابھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ بیعتِ خلافت سے محروی انسان کو جاہلیت کی حالت میں پہنچا دیتی ہے، صراحتاً یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلم معاشرہ نظامِ خلافت کے بغیر ہوتا ہی نہیں، یا کم از کم یہ کہ اسے ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اور جب حقیقت یہ ٹھیری تو یہ گویا اس بات کا اعلان و اظہار ہے کہ اس نظام کا قائم کرنا اور قائم رکھنا اس معاشرے کی ایک

لازی اور فطری ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اس عالم اسباب میں کوئی نظام حکومت آپ سے آپ قائم نہیں ہوا کرتا، بلکہ کسی انسانی گروہ کی کوششوں ہی سے قائم ہوا کرتا ہے۔ اس لیے مسلم معاشرہ بھی اس وقت تک 'باحکومت' نہیں ہوسکتا جب تک وہ خود اس کی ذمہ داری محسوس نہ کرے اور اس کے لیے ضروری کوششیں انجام نہ دے۔

رہی دوسری حدیث، تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس بارے میں اس کی حیثیت صاف طور پر واضح اور راست ہدایت کی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسی اجتماعی زندگی بسر کرنے کا صریح حکم دیا گیا ہے جو کوئی معمولی قسم کی نہیں بلکہ 'سمع' اور 'طاعت' والی اجتماعی زندگی ہے، یعنی ایک ایسی زندگی جس میں احکام جاری ہوتے ہوں، جس کے اندر کوئی حکم دینے والا ہو اور لوگ اس کی طاعت کرنے والے ہوں۔ صاف لفظوں میں یہ کہ جو ایک 'نظامِ امر و طاعت' یا ایک 'حکومتی ادارہ' رکھنے والی اجتماعی زندگی ہو۔ کیوں کہ 'سمع و طاعت' کا وجود کسی نہ کسی طرح حکومت کے وجود ہی پر موقوف ہے۔ جہاں حکومت نہ ہو وہاں اس 'سمع و طاعت' کا بھی کوئی سوال باقی نہ رہ جائے گا۔ چنانچہ یہ دونوں الفاظ احادیث میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، اور قریب قریب ہر جگہ ان سے مراد اُمرا و حکام کی اطاعت ہی ہے۔

(۳) اسوۂ رسول کا حال اس باب میں ساری دنیا پر روشن ہے۔ آپؐ معناً تو ابتدا ہی سے صاحب امر و حکم تھے، مگر ہجرت کے بعد تو آپ کی یہ حیثیت ظاہری اور اصطلاحی طور پر بھی پوری طرح نمایاں ہوگئی، اور پھر آخر دم تک نمایاں سے نمایاں تر ہی رہی۔ سارے اہلِ ایمان ایک قوم، ایک ملت اور ایک جماعت تھے اور آپؐ اس کے قائد و سربراہ تھے۔ پورا اسلامی خطۂ ارض ایک مملکت تھا، اور آپؐ اس مملکت کے حکمران تھے۔ غرض ایک اسٹیٹ اور ایک گورنمنٹ کا جو مفہوم ہوتا ہے وہ مسلم آبادی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں پوری طرح موجود پایا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ کی مدنی زندگی کا لمحہ لمحہ اس بات کا گواہ ہے کہ اسلام کے ساتھ، مسلم معاشرے کے ساتھ، منصب رسالت کے ساتھ ایک ریاست اور حکومت کا تصور معنیٰ و حقیقت کی حد تک تو ہر وقت، اور

عملی طور پر بشرطِ امکان، لازماً وابستہ ہے۔ ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ کے رسولؐ نے ایک ایسا کام کیا اور پیہم کیا، جس کا اللہ کے دین سے کوئی تعلق نہ تھا، ایک ایسی حیثیت اختیار کی اور مسلسل اختیار کیے رکھی، جو نبوت کے تقاضوں میں شامل نہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا خیال کرنا کسی اور کے لیے ممکن ہوتو ہو، ان لوگوں کے لیے کسی طرح ممکن نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔

(۴) اسوۂ صحابہ جو کچھ اس مسئلے میں رہا ہے، اس کی ضروری تفصیل یہ ہے:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو حضرات صحابۂ کرامؓ نے جس کام کو سب سے اہم سمجھا اور جس ہر دوسرے کام پر مقدم رکھا، وہ خلیفۂ رسول کا انتخاب اور نظمِ خلافت کا قیام تھا۔ حتیٰ کہ تدفین کے فریضے کو بھی مؤخر رکھا گیا۔ نعش مبارک رکھی رہی۔ جب خلیفہ کا انتخاب ہو گیا، تب جا کر اسے دفن کیا گیا۔ صحابہ کا یہ طرزِ عمل نہ اختلافی تھا نہ ہنگامی، بلکہ اجماعی بھی تھا اور مستقل بھی۔ یعنی انہوں نے ایسا پورے اتفاق رائے سے کیا، اور پھر بعد میں بھی ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ جب کسی خلیفہ کا انتقال ہوا تو اس وقت تک اُسے دفن کرنے کے فریضے کی طرف متوجہ نہ ہوئے جب تک کہ اس کے جانشین کا انتخاب نہ کر لیا۔ (شرح عقائد نسفیہ صفحہ ۱۱۰) صحابہ کرام کا یہ متفقہ اور مستقل طرزِ عمل نظمِ حکومت کی ضرورت واہمیت کے بارے میں ان کے جس شدید احساس کا مظہر ہے، وہ شاید ہی اپنی کوئی نظیر رکھتا ہو۔ یہ ان حضرات کا اس بات پر غیر مشکوک اجماع تھا کہ مسلم معاشرہ ایک امام وخلیفہ، دوسرے لفظوں میں ایک حکومتی ادارے سے ہرگز خالی نہیں رہ سکتا۔ دینی حیثیت سے یہ ایک ناقابل قبول صورت حال ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفاتِ رسولؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الا ان محمدا قد مات ولا بد لھذا الدین ممن یقوم به.

(کتاب المواقف وشرحہ، جلد ۸ صفحہ ۳۴۶)

''آگاہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں، اور اب اس دین کے لیے ایک ایسا شخص

بہرحال ضروری ہے جو اس (کے قیام ونفاذ) کا ذمہ دار رہے۔''

آں جناب کا منشا ان لفظوں سے واضح طور پر ایک خلیفہ کے انتخاب وتقرر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ بات صحابہ کے بھرے مجمع میں کہی گئی تھی، اور ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اس کے صحیح اور برحق ہونے سے انکار کیا ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ:

لا اسلام الا بالجماعة ولا جماعة الا بامارة. (جامع بیان العلم)

''جماعت کے بغیر اسلام نہیں، اور امارت کے بغیر جماعت، جماعت نہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جب خوارج نے **لاحکم الا لله** کا نعرہ لگایا تو آپ نے فرمایا:

انما یقولون لا امارة ولا بد من امارة برة اوفاجرة.

(الملل والنحل للشہرستانی جلد اول صفحہ ۵۵)

''ان کا کہنا تو یہ ہے کہ کوئی امارت (اور حکومت) ہونی ہی نہ چاہیے، حالانکہ امارت بہرحال ضروری ہے، چاہے وہ اچھی ہو چاہے بُری۔''

رسولِ خدا کے ان معیاری جانشینوں اور دینِ حق کے ان بہترین ترجمانوں کے یہ ارشادات آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر نظر ڈالیے، اور پھر سوچیے کہ کیا کوئی لفظ ایسا ہو سکتا ہے جو ایک حکومتی ادارے کو دین وملت کی ایک ناگزیر ضرورت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو اور وہ ظاہراً یا معناً، ان میں استعمال نہ کیا گیا ہو؟

جس حکومتی نظام کی ضرورت پر قرآن مجید، حدیث شریف، اسوۂ رسول اور اقوال واعمال صحابہ، سب کی شہادتیں موجود ہوں، اور ایسے واضح اور قطعی انداز کی موجود ہوں، علمائے شریعت اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ مسلم معاشرے کی یہ ایک لازمی ضرورت ہے اور اس نظام کا قائم کرنا اور قائم رکھنا اس کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ قاضی ماوردی لکھتے ہیں:

عقدها لمن یقوم بما فی الامة واجب بالاجماع. (الاحکام السلطانیہ: ص ۳)

''امامت (یعنی خلافت) کا، ایک ایسے شخص کے لیے انعقاد، جو امت کے اندر اس کی

ذمہ داریوں کو پورا کر سکے، بالاجماع واجب ہے۔"

اسی طرح علامہ تفتازانی شرح عقائد نسفیہ میں فرماتے ہیں کہ:

الاجماع علی ان نصب الامام واجب. (صفحہ ۱۱۰)

"اس بات پر اجماع ہے کہ امام (یعنی خلیفہ) کا تقرر واجب ہے۔"[1]

یعنی امت کے لیے اپنا ایک حکومتی نظام قائم کرنا شرعاً واجب ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہوتی تو یہ ایک اجتماعی معصیت ہوگی، جس کے لیے اسے اللہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑے گا۔

آگے اس وجوب کی دلیلیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ولان کثیرا من الواجبات الشرعیة یتوقف علیه. (ایضاً)

"اور اس لیے کہ بہت سے شرعی واجبات کا ادا ہونا اسی (امامت) پر موقوف ہے۔"

اور دراصل یہ واجبات شرعیہ کی ادائی ہی وہ سب سے بنیادی غرض اور ضرورت تھی جس کی بنا پر رسولؐ نے وہ کچھ کیا اور فرمایا ہے جو اوپر کی سطروں میں مذکور ہے۔ جس نظامِ حکومت کے بغیر دین کے کثیر التعداد واجبات ادا ہو ہی نہیں سکتے، کیسے ممکن ہے کہ وہ تو موجود نہ ہو، مگر دین صحیح معنوں میں موجود ہو؟ ماننا ہی پڑے گا کہ حکومتی نظام کے بغیر اسلام اپنی صحیح اور کامل شکل میں کبھی نمودار نہیں ہوسکتا، اور عقل عام یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ جس 'اسلام' کے پاس حکومت اور نظام حکومت نہ ہو، اس کی حیثیت ٹھیک ایک لنگڑے لولے اور اپاہج جسم کی سی ہے۔ ایسے جسم کو اگرچہ مردہ لاش نہ کہا جائے گا، مگر ایک تندرست اور کارآمد وجود بھی نہ قرار دیا جاسکے گا، اور نہ کبھی اس سے وہ کارنامے انجام پاسکیں گے جو تندرست اور صحیح الاعضا جسموں ہی سے متوقع ہوتے ہیں۔

---

[1] اس اجماع میں خارجیوں کے ناقابلِ ذکر گروہ کے سوا سبھی لوگ شریک ہیں۔ البتہ فرقہ امامیہ اور فرقہ اسماعیلیہ کا خیال یہ ہے کہ امام کا تقرر واجب تو ہے مگر خلق کے ذمے نہیں، بلکہ خدا کے ذمے۔ خوارج کے نزدیک امام کا تقرر اور نظام حکومت کا قیام صرف جائز ہے، واجب نہیں ہے (کتاب المواقف وشرحہ، جلد ۸، صفحہ ۳۴۵)۔ لیکن یہ دونوں طرح کے خیالات، عملی، عقلی اور شرعی ہر حیثیت سے اتنے پوچ ہیں کہ ان کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔

اسلام اور حکومتی نظام کا یہ لازمی تعلق صرف اسی 'اسلام' تک محدود نہیں ہے، اور نہ اصولاً ہوسکتا ہے، جسے قرآن اور نبی آخرالزماں نے پیش فرمایا ہے، بلکہ ہر 'اسلام' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر دین تک اس کا دائرہ وسیع ہے۔ چنانچہ اُمتِ مسلمہ کی پیش رو اُمت (بنی اسرائیل) کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ.

(مسلم کتاب الامارۃ)

"بنی اسرائیل کا نظام وسبق ان کے انبیا چلاتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پا جاتا تو اس کی جگہ دُوسرا نبی مبعوث ہو جاتا۔"

اس "نظم ونسق" کی مختلف اوقات میں چاہے بظاہر جو شکلیں بھی رہی ہوں، لیکن اتنی بات تو تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ ہر حال میں وہ حقیقتاً ایک حکومتی نظام ہی ہوتا تھا، البتہ اس کی معیاری اور مکمل شکل وہ تھی جو حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دَور میں پائی گئی۔ اس حدیث کے اندازِ بیان کو ذرا غور سے دیکھیے۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ملت اسرائیل میں عموماً حکومتی نظم ونسق برابر قائم رہا کرتا اور براہ راست اس کے نبیوں کے فرائض میں داخل ہوا کرتا تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ان انبیا کے مقصد بعثت تک میں شامل رہا کرتا تھا۔ یہ نکتہ، دین کے لیے سیاست کی، اور اہل دین کے لیے حکومتی نظام کی ضرورت کو روشن سے روشن تر کر دیتا ہے۔

خلافت کے فرائض

جس شخص کا خلافت کے منصب پر تقرر ہوگا، اس کا کام عام حکمرانوں سے بہت وسیع اور بہت مختلف ہوگا۔ یہ منصب اول وآخر ایک شرعی منصب ہے اور شریعت نے اپنے متعینہ مقصد ہی کی خاطر اسے قائم کیا ہے۔ اس لیے خلیفہ کا فرض یہ ہوگا، اور صرف یہی ہوگا کہ وہ اس مقصد کو پورا کرے۔ یہ مقصد دو لفظوں میں 'اللہ کے دین کا قیام' ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً آپؐ فرماتے ہیں کہ:

اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

''اگر کوئی ایسا غلام بھی تمھارا امیر بنا دیا جائے جس کے اعضا کٹے ہوئے ہوں، لیکن وہ قانون الٰہی کے مطابق تمھاری سرداری کرے، تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔''

ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّہُ اللّٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ. (بخاری، کتاب الاحکام)

''یہ چیز (یعنی خلافت) قریش میں رہے گی۔ جو شخص اس معاملے میں ان کے خلاف محاذ آرائی کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل گرا دے گا، جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں۔''

ان حدیثوں کے دیکھنے کے بعد اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ کوئی امیر عوام کی فرماں برداری کا، اور کوئی خلیفہ خلافت کے اقتدار کا واقعی حق دار اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے قوانین اور مصالح کے تحت اپنے فرائض انجام دے، اور اللہ کے دین کو قائم رکھے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی منصب کا حق دار باقی رہنا جس چیز پر موقوف ہوا کرتا ہے، وہ صرف وہ فریضہ اور مقصد ہوتا ہے جس کی خاطر یہ منصب قائم کیا گیا ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوا کہ منصب خلافت کے قیام کی غرض و غایت، اور خلیفہ کا فرضِ منصبی صرف اقامتِ دین ہے۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ فقرہ ابھی ہمارے سامنے آ چکا ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور اب اس دین کے لیے ایک ایسے شخص کی بہر حال ضرورت ہے جو اس کے (قیام و نفاذ) کا ذمہ دار ہو۔''

یہ فقرہ جو دراصل صرف ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کا نہیں بلکہ پورے گروہ صحابہؓ کا فقرہ تھا، اس بات کا صریح اعلان ہے کہ خلیفہ کا وجود اگر مطلوب ہے تو صرف اللہ کے دین کو قائم رکھنے کے لیے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جسے اسے انجام دینا ہوتا ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں علما نے بجا

طور پر 'امامت' (یعنی خلافت) کی تعریف ہی ان لفظوں میں کی ہے:

هی خلافة الرسول فی اقامة الدین. (کتاب المواقف)

''امامت نام ہے دین کی اقامت کے معاملہ میں رسولؐ خدا کی جانشینی کا۔''

'دین کی اقامت' کا مفہوم اتنا ہی وسیع اور ہمہ گیر ہے جتنا کہ خود 'دین' کا مفہوم۔ کتاب و سنت میں جتنے احکام ہیں، وہ سب کے سب 'دین' ہیں۔ اس لیے 'دین کی اقامت' کا مطلب یہ ہوا کہ مسلم معاشرے سے اس پورے مجموعے کے تحت زندگی بسر کرائی جائے۔ اس اجمال کی پوری تفصیل ظاہر ہے کہ بڑی طولانی ہوگی، جس کا نہ یہاں کوئی موقع ہے اور نہ کوئی ضرورت۔ البتہ اس کے بنیادی نکات ضرور معلوم کر لینے چاہییں، تاکہ خلیفہ کے فرائض کا ایک خاکہ سامنے آ جائے۔ اس غرض کے لیے اگر آپ ان اسباب و مصالح پر پھر سے نظر ڈال لیں جن کی بنا پر شریعت نے اس منصب کا قائم کرنا ضروری قرار دیا ہے، تو ان نکات کا تعین کچھ اس طرح پر ہوگا:

۱۔ دین کی علمی و نظری حفاظت، دینی علوم کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں میں دینی یقین کی بقا و ترقی کا اہتمام۔

۲۔ دین کی عملی بنیادوں (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کو قائم رکھنا اور معاشرے میں ان کی طرف سے غفلت نہ پیدا ہونے دینا۔

۳۔ دین و ملت کا دشمنوں سے دفاع کرنا، اور اس غرض کے لیے جنگ و جہاد کے جملہ فرائض انجام دینا۔

۴۔ معاملات کا فیصلہ اور عدل کا قیام۔

۵۔ مجرموں پر سزاؤں کا نفاذ۔

۶۔ افراد معاشرہ کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت، اور امن و امان کا قیام۔

۷۔ اندرونِ معاشرہ بھی اور بیرون معاشرہ بھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا پورا اہتمام۔

اگر آپ چاہیں تو مزید نکات کے بھی نام لے سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض علما نے فرائض خلافت

کی تعداد اس سے زیادہ بتائی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس ضمن میں جن دوسری چیزوں کا نام لیا جاسکتا ہے وہ یا تو انھی آٹھوں میں سے کسی کے اندر شامل ہوں گی، یا پھر ان کی نوعیت بنیادی نکات کی نہ ہوگی۔

خلافت کے حقوق

خلافت یا خلیفۃ المسلمین کے فرائض جتنے وسیع اور ہمہ گیر ہیں، اس کے حقوق بھی اتنے ہی عظیم ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی دوسری حکومت اور حکمراں شخصیت وہ حقوق نہیں رکھتی جو اسے حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی تفصیل یہ ہے:

ا۔ اطاعت: سب سے پہلا حق تو یہ ہے کہ اس کے احکام سنے اور مانے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء:۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی، نیز اپنے میں کے اصحابِ امر کی۔"

اس آیت میں 'اصحابِ امر' کی اطاعت کا، جن میں خلیفۃ المسلمین بداہتاً سرفہرست ہے، واضح حکم دیا گیا اور اسے اہلِ ایمان کے لیے ضروری ٹھیرایا گیا ہے۔ اس طرح ضروری کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے حکم کے پہلو ہی میں یہ حکم بھی ثبت کر دیا گیا ہے۔ اس اندازِ کلام کا جو تقاضا ہے وہ اہلِ نظر پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تقاضے کی شرح فرمائی تھی جب یہ ارشاد ہوا تھا کہ:

مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ يَّعْصِنِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ. (مسلم جلد:۲)

"جس نے میرا حکم مانا اس نے دراصل اللہ کا حکم مانا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے دراصل اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے اپنے امیر کا حکم مانا اس نے دراصل میرا حکم مانا، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے دراصل میری نافرمانی کی۔"

جو اطاعت، فی الواقع اللہ و رسولؐ کی اطاعت بن جاتی ہو، وہ افراد کی اپنی مرضی اور سہولت پر موقوف نہیں رہ سکتی۔ اس کا تو حق ہوگا کہ اسے اشخاص کی طبعی آمادگیوں سے یکسر بلند رکھا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

وَعَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبَايَعْنَا فَكَانَ فِيْ مَا اَخَذَ عَلَيْنَا اَنْ بَايَعْنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِيْ مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا. الخ

(مسلم، کتاب الامارة)

''ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور آپؐ سے ہم نے بیعت کی تو ان باتوں میں جن کا ہم سے آپؐ نے عہد لیا، یہ بات بھی شامل تھی کہ ہم ہر حال میں، چاہے ہمیں گوارا ہو یا ناگوار، ہم تنگی کے عالم میں ہوں یا کشادگی کے عالم میں، اپنے امرا کے احکام سنیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔''

پھر صرف یہی نہیں کہ طبیعت کی ناگواری اور تنگی و پریشان حالی کے وقت بھی سمع و طاعت ایک مسلمان کا فرض ہے، بلکہ یہ فرض اس وقت بھی اپنی جگہ جوں کا توں برقرار رہتا ہے جب یہ حکم دینے والے بے کرداری کے شکار ہوں، اور حقوق کے مواقع پر انھیں اپنی ذات سب سے پہلے یاد آتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ حدیث اطاعت میں آگے یہ الفاظ بھی آتے ہیں:

وَاَثَرَةٍ عَلَيْنَا.

''اور اس وقت بھی ایسا ہی کریں گے جب ہمارے خلاف ترجیح برتی جا رہی ہو۔''

اور بات اب بھی اپنی حد کو نہیں پہنچی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا تو یہاں تک ہے کہ:

تَسْمَعُ وَتُطِعُ وَاِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ وَاُخِذَ مَالُكَ فَاسْمَعْ وَاَطِعْ.

(مسلم، کتاب الامارة)

''تمھیں (امرا کے حکموں کو) سننا اور ماننا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر تمھاری پیٹھ زخمی کر دی جائے اور تمھارا مال چھین لیا جائے تو بھی سنتے اور مانتے رہنا۔''

یہ، اور اسی طرح کی متعدد حدیثیں مسلمانوں کو تلقین کرتی ہیں کہ وہ اپنے خلاف سب کچھ جھیلتے رہیں، مگر سمع و طاعت کے دامن کو ہرگز نہ چھوڑیں۔ جب تک ایک شخص امارت یا خلافت کے منصب پر فائز ہے، اس کی اطاعت کا حق ناقابلِ انکار ہے، اور مسلمان کا فرض ہے کہ اس حق کو

برابر تسلیم کرتا رہے۔ اس کی بے کرداری اور اس کی بے انصافی اور ستم کوشی بھی اس کے اس حق کو ساقط نہیں کر سکتی۔

یہ 'حق' کتنی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کا انکار مسلمان کو کہاں پہنچا دیا کرتا ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کی حدیثوں سے لگائیے:

مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَهُ. (مسلم، کتاب الامارۃ)

"جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے پاس (اپنی روش کے حق ہونے پر) کوئی دلیل نہ ہوگی۔"

معلوم ہوا کہ امراء و خلفاء کی نافرمانی کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو یہیں ختم ہو جاتا ہو، بلکہ ایسا ہے جو کل خدا کے حضور بھی پیش ہوگا۔ اور جب پیش ہوگا تو وہاں اس جرم کی صفائی میں کوئی بات نہ کہی جا سکے گی۔ آدمی کو اقراری مجرم بننے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ رَاٰى مِنْ اَمِيْرِهٖ شَيْئًا يَكْرَهُهٗ فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ فَاِنَّهٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (بخاری، کتاب الفتن)

"جو کوئی اپنے امیر کے ہاتھوں کوئی ناگوار حرکت سرزد ہوتے دیکھے، اسے چاہیے کہ صبر کرے (اور اس کی وجہ سے اس کی اطاعت سے منہ موڑ لینے کی ہرگز نہ سوچے)، کیونکہ جو شخص بالشت برابر بھی جماعت سے الگ ہو رہے گا وہ جاہلیت کی حالت میں مرے گا۔"

یہ حدیث جہاں ایک طرف اُس حقیقت پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہے جو پہلی حدیث سے معلوم ہوئی تھی، وہیں دوسری طرف یہ بھی بتا دیتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ کہتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت اسلامی اجتماعیت اور ملی تنظیم کے نشان کی ہوتی ہے، اس لیے اس کی اطاعت سے انکار صرف ایک فرد کی اطاعت کا انکار نہیں ہوتا، بلکہ دراصل اس پوری اجتماعی تنظیم سے علیحدگی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خطرناک اقدام ہے جس کے بعد خود مسلمان ہونے

کا دعویٰ بھی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ آدمی اپنی تمام تر دین داریوں کے باوجود جب مرتا ہے تو ایک طرح کی جاہلی موت مرتا ہے۔ بلکہ بعض احادیث سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ کُھلی جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ چنانچہ یہ تنبیہ ہماری نظروں سے گزر بھی چکی ہے کہ:

مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ اِلَّا اَنْ يُّرَاجِعَ. (مشکوٰۃ، بحوالہ ترمذی)

"جو کوئی جماعت سے بالشت برابر بھی الگ ہو رہا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ نکال پھینکا، اِلّا یہ کہ وہ جماعت کی طرف پھر لوٹ آئے۔"

۲۔ محبت: خلافت کا حق یہ بھی ہے کہ صاحب امر سے محبت رکھی جائے۔ جس طرح ظاہر میں اس کے احکام کی اطاعت ہو، اسی طرح دلوں میں اس کی ذات کے لیے جگہ موجود ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

"تمھارے اچھے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم کو محبت ہو اور تم سے انھیں محبت ہو، اور جن کے لیے تم رحمت کی دعائیں کرو اور وہ تمھارے لیے کریں۔ اسی طرح تمھارے بُرے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم بُغض رکھو اور وہ تم سے بُغض رکھیں، اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔"

"اچھے خلفا وہ ہوں گے" یعنی ایک خلیفہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کی اصل پوزیشن یہی ہے کہ لوگ اس کے لیے بہترین جذبات رکھیں، اس کے دل سے خیر خواہ ہوں، اور ان کی نگاہوں سے اس کی محبت اور عقیدت ٹپکی پڑتی ہو۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں اس رویے کو دین داری کا راست تقاضا قرار دیا گیا ہے:

اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ. (مسلم)

"دین اخلاص مندی کا نام ہے۔ ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا: "کس کے لیے اخلاص

مندی کا؟'' ارشاد ہوا: ''اللہ کے رسولؐ کے لیے، مسلمانوں کے خلفا کے لیے، اور عام مسلمانوں کے لیے۔''

یہی وجہ ہے کہ خلافت کی بیعت کو صرف ایک ظاہری اور رسمی اظہارِ وفاداری نہیں کہا گیا ہے، بلکہ ''اپنی متاعِ قلب دے دینے'' سے تعبیر کیا گیا ہے:

مَنْ بَایَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ یَدِهٖ وَثَمْرَةَ قَلْبِهٖ فَلْیُطِعْهُ مَا اسْتَطَاعَ.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

''جس نے خلیفہ سے بیعت کر لی، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور اپنی متاعِ قلب اس کے حوالے کر دی، اسے چاہیے کہ اپنے بس بھر اس کی پوری پوری اطاعت کرتا رہے۔''

گویا خلیفۃ المسلمین سے بیعت، عہدِ اطاعت ہی نہیں عہدِ اخلاص و محبت بھی ہے۔

۳۔ **بیعت برائے دین و آخرت:** خلافت کا تیسرا حق یہ ہے کہ اسے دنیا کی نہیں بلکہ دین کی ضرورت سمجھا جائے، اور خلیفہ سے جو بیعت کی جائے، اس کے پیچھے اصل محرک صرف آخرت اور رضائے الٰہی ہو۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ثَلَاثَةٌ لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ...... وَرَجُلٌ بَایَعَ اِمَامًا لَا یُبَایِعُهٗ اِلَّا لِدُنْیَا.

(بخاری، ج ۲، کتاب الاحکام)

''تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (بوجہ ناراضی) مخاطبت نہ فرمائے گا...... ایک اس شخص سے جس نے خلیفہ سے بیعت صرف دنیوی غرض سے کی ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ خلیفۃ المسلمین کی بیعت یا اطاعت سے انکار ہی ایک مسلمان کے لیے ناروا اور مہلک نہیں ہے، بلکہ وہ نام نہاد بیعت اور اطاعت بھی ایسی ہی ثابت ہوگی جو محض دنیوی مصلحتوں کی خاطر کی گئی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور سے حکومتوں کی وفاداریاں اسی طرح ہوا کرتی ہیں، اور یہی ان کے لیے بس بھی کرتی ہیں۔ مگر اسلام کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ جس چیز کو دوسری حکومتیں اپنا آخری مطلوب سمجھتی ہیں، اسلام کی نگاہ میں اصلاً اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے نزدیک یہ اطاعت اور یہ بیعت اسی وقت باوزن اور قابلِ قدر ہوگی جب کہ وہ دین کی

ضرورت سمجھ کر اور اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی ہو۔

خلافت اور خلیفۃ المسلمین کو یہ غیر معمولی حقوق جس وجہ سے دیے گئے ہیں، پچھلے مباحث میں اس کی پوری وضاحت بھی گزر چکی ہے۔ بیعت کو دین و آخرت کی ضرورت سمجھتے ہوئے منعقد کرنا خلافت کا حق اسی لیے ہے کہ خلافت کی حیثیت بنیادی طور پر یہی ہے۔ چنانچہ واضح دلائل کی روشنی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خلافت ایک اہم ترین دینی ضرورت ہے، اور اس کا قیام شرعاً واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ جو منصب بنیادی طور پر ایک دینی منصب ہو اس کا وہی ماننا واقعی ماننا ہو سکتا ہے جب اسے دینی منصب سمجھ کر مانا گیا ہو، ورنہ اس کا ماننا ایک کھلا ہوا فریب ہوگا۔ آخر جس چیز کی اصل بنیادی حیثیت ہی کسی کو تسلیم نہ ہو، وہ اس کے تسلیم کرنے کا دعویٰ اگر کرتا ہے تو اس کے اس دعوے کو کون صحیح باور کر سکتا ہے؟ رہا محبت اور اطاعت کا حقوق خلافت میں سے ہونا، تو یہ بات بھی بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ جو منصب دین ہی کی خاطر قائم کی گئی ہو اور جس کی حیثیت سرتا سر شرعی ہو، اسے ایک مسلمان فطری طور پر محبت اور عقیدت ہی کی نظروں سے دیکھے گا، اور اس کے ساتھ اس کا عملی رویہ طاعت و فرماں برداری ہی کا ہوگا۔ یہی اس کے ایمان کا تقاضا ہوگا اور اسی میں اس کے جذبۂ دینی کو آسودگی مل سکے گی۔ خصوصاً اطاعت تو اس کے دین و ایمان کا راست اور بدیہی مطالبہ ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر خلافت کا وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ آخر جہاں لوگ اطاعت کے لیے تیار ہی نہ ہوں، وہاں کسی حکومت اور امارت کا کیا مفہوم باقی رہ جائے گا؟ لوگوں کا اطاعت سے انکار تو عملاً نظامِ حکومت کے ختم ہو جانے کا واضح اعلان ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ خلفا کی اطاعت پر اتنا زور دیا گیا، اور امکان کی آخری حد تک اس فرض کے نباہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی یہ فرض فرض ہی رہتا ہے جب رعایا کی پیٹھیں اُدھڑ رہی ہوں، اور اس وقت بھی اس حقِ اطاعت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا جب جان و مال تک کی امان باقی نہ رہ گئی ہو۔ اسلام کے آئین میں یہ دفعہ صرف اس لیے ثبت کی گئی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی اطاعت کا معاملہ فی الواقع اس کی ذات کی اطاعت کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ احکامِ خدا اور رسول کی

اطاعت کا، اور دین کے اجتماعی نظام کی بقا کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اپنی ذات میں ناقص اور بے کردار سہی، مگر جب تک وہ خلافت کے منصب پر فائز ہے اسی کی فرماں روائی سے اس نظام کا عملی نفاذ وابستہ ہے، اسی پر دین کے ایک بڑے حصے کی پیروی موقوف ہے، اور اس کے بغیر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اسلامی بن ہی نہیں سکتی۔ یوں کہیے کہ وہ اس زمین پر دراصل اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کا عملی مظہر، اور اس کے اقتدار کا ظاہری نشان ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مسلمان سب کچھ سہے گا، اور ہر بات گوارا کر لے گا، مگر اس 'مظہر' کو غائب اور اس 'نشان' کو مٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ یہ تو ضرور برداشت کر لے گا کہ اسلام کے گھر میں بھی مسلمان کو سلامتی میسر نہ ہو، لیکن یہ کبھی برداشت نہ کرے گا کہ اسلام کا یہ گھر ڈھ جائے اور دین کے اجتماعی نظام سے وہ محروم ہو رہے۔ اور اگر کوئی اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایمان کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی دنیا کے مفاد کو دینی نظام کی بقا پر کھلی ہوئی ترجیح دے رہا ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ایمان و اسلام کے ساتھ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

طاعت کی حدود

یہی مصلحت جس کی خاطر اصحابِ امر کی اطاعت پر اتنا زور دیا گیا ہے، یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اطاعت غیر معمولی حد تک ضروری تو ہو، مگر ہر حال میں ضروری نہ ہو، بلکہ ایک خاص حد کے بعد الٹا اس کا انکار ضروری بن جائے۔ کیونکہ ایک مسلمان اپنے امیر کی اطاعت میں جو کچھ بھی گوارا کرتا ہے، وہ صرف اسی لیے تو کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس نظام پر ضرب نہ لگنے پائے جس پر اجتماعی زندگی میں اس کا 'مسلمان' باقی رہنا موقوف ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ مطالبہ کسی ایسی اطاعت کا، یعنی کسی ایسی بات کے صرف گوارا کر لینے کا نہیں بلکہ اس کے کر ڈالنے کا ہو رہا ہو جس سے خود اس نظام کو مقصد ہی فوت ہو جاتا ہو، تو یقیناً وہ اسی بات کی مستحق ہو گی کہ اسے دیوار پر دے مارا جائے۔ چنانچہ شریعت نے جس صراحت اور زور کے ساتھ اطاعت امر کی تلقین کی ہے، اسی صراحت اور زور کے ساتھ یہ بھی فرما رکھا ہے کہ یہ اطاعت غیر مشروط ہرگز نہیں ہے بلکہ قطعی

مشروط ہے، اور ایک خاص حد کے اندر ہی کی جانی چاہیے۔ اس 'شرط' اور 'حد' کا تعین اس نے منفی جہت سے لفظ 'معصیت' کے ذریعے سے اور مثبت جہت سے لفظ 'معروف' کے ذریعے سے کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

لَاطَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ. (مسلم)

''اللہ کی معصیت کے کام میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت صرف 'معروف' میں ہوگی۔''

یعنی اطاعت کی شرط یہ ہے کہ حکم کسی 'معروف' کا دیا گیا ہو، نہ کہ کسی 'معصیت' کا۔ معصیت کا حکم لازماً ٹھکرا دیا جائے گا اور اس کی تعمیل نہیں بلکہ عدم تعمیل ضروری ہوگی، ٹھیک ویسی ہی ضروری جیسی کہ 'معروف' کے حکم کے موقع پر اس کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

اجمع العلماء علی وجوبها فی غیر معصیة و علٰی تحریمها فی المعصیة.

(شرح مسلم جلد۲، کتاب الامارۃ)

''علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اصحابِ امر کی اطاعت ایسے کاموں میں جو معصیت کے نہ ہوں واجب ہے، اور ایسے کاموں میں جو معصیت کے ہوں، حرام ہے۔''

معصیت کے کاموں میں کسی بھی صاحبِ امر کی اطاعت کس حد تک ممنوع اور کیسی حرام ہے؟ اس بات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کی سرکردگی میں جہاد کے لیے ایک دستہ روانہ فرمایا، اور حسبِ دستور اسے ہدایت دے دی کہ اپنے امیر کی اطاعت کرتے رہنا۔ دورانِ سفر میں ایک بار وہ ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انتہائی غصے کے عالم میں انھیں حکم دیا کہ لکڑیاں اکٹھی کریں۔ جب لکڑیاں اکٹھی کی جا چکیں تو کہا، ان لکڑیوں کو آگ دے دو۔ جب آگ دے دی گئی تو انھیں مخاطب کر کے فرمایا:

''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں اس بات کی تاکید نہیں فرمائی ہے کہ میری سننا اور اطاعت کرنا۔''

لوگوں نے جواب دیا: ''ہاں، فرمائی ہے۔''

اس پر انہوں نے کہا: ''اچھا تو اس آگ میں پھاند پڑو۔''

یہ سن کر لوگ ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے، اور کچھ لوگ اس حکم کی تعمیل پر تیار بھی ہو گئے۔ مگر اور لوگوں نے کہا:

''ہم تو آگ ہی سے بچنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھاگ کر آئے تھے (پھر اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس میں از خود جا پھاندیں؟)''

غرض تھوڑی دیر بحث و تکرار اور کشش و پنج کی یہی حالت رہی۔ اس دوران میں امیر لشکر کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا، اور آگ بھی بجھ گئی۔ پھر جب یہ سب لوگ اپنی مہم سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے تو وہاں یہ پورا واقعہ بیان کیا گیا۔ آپؐ نے سننے کے بعد ان لوگوں کو خطاب کر کے، جو حکم امیر کی اطاعت میں آگ کے اندر پھاند پڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے، فرمایا:

''اگر تم آگ میں پھاند پڑے ہوتے تو پھر قیامت تک اسی میں پڑے رہتے۔''

(مسلم، جلد دوم، کتاب الامارۃ)

اس واقعہ اور اس ارشاد نبوی سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس وقت بھی حرام ہی رہتی ہے جب کہ وہ کسی امیر کے کہنے پر کی گئی ہو، اور ٹھیک ویسی ہی حرام رہتی ہے کہ کسی اور وقت ہوسکتی ہے۔ طاعتِ امر کا فلسفہ اسے ہرگز قابلِ معافی نہیں بنا دے سکتا۔

جس 'معروف' میں امرا کی اطاعت ضروری ہے، اس کی وسعتیں کہاں تک پہنچتی ہیں؟ اس کی وضاحت بھی اسی لفظ 'معصیت' سے ہو جاتی ہے جو مسئلۂ اطاعت کے منفی پہلو کو بیان کرنے کے لیے مذکورہ بالا حدیث اور دوسری بہت سی حدیثوں میں لایا گیا ہے۔ جب یہ فرما دیا گیا کہ ''معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت تو صرف معروف میں ہوتی ہے'' تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جن احکام کی تعمیل میں اللہ تعالیٰ کی 'معصیت' لازم نہ آ رہی ہو وہ سب کے سب ''معروف'' کے احکام ہوں گے، اور ان کی بجا آوری ضروری ہوگی۔ گویا وہ سارے امور جن کی نوعیت امورِ تدبیر کی ہوتی ہے اور جن میں مختلف پہلوؤں کے پیشِ نظر ایک سے زائد آرا ہوسکتی

ہیں، 'معروف' ہی کی حدود میں داخل ہیں۔ یعنی ایسے امور میں صاحب امر کے احکام کی معقولیت سے کسی شخص کو چاہے کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو، اور اپنی رائے کے صائب ہونے پر کتنا ہی گہرا اطمینان وہ کیوں نہ رکھتا ہو، ان احکام کو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا، اور یہ اس کا شرعی فریضہ ہوگا۔ کیونکہ اس طرح کا ہر حکم 'معروف' کا حکم ہے، اور 'معروف' میں امیر کی اطاعت ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کو اپنی رائے کے صائب ہونے پر جو اطمینان ہو وہ بالکل صحیح بنیادوں پر ہو، اور رائے فی الواقع اسی کی ٹھیک ہو، مگر اس کے باوجود اسے یہ حق ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ وہ امیر پر کم اندیشی اور بے تدبیری کا الزام لگا کر اطاعت سے انکار کر دے۔ اس انکار کا حق اسے نہ تو اس کا اپنا ذوق اور وجدان دلا سکتا ہے، نہ اپنی دُور اندیشی اور اصابت رائے کا یقین، اور نہ دنیا کی کوئی اور چیز۔ یہ حق اسے صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ حکم 'معروف' کا نہیں، بلکہ اللہ کی 'معصیت' کا دیا گیا ہو۔ ایسی حالت میں تو اس کا یہ حق ہی نہیں بلکہ فرض ہوگا کہ اس کی اطاعت سے صاف انکار کر دے۔

خلفا کی معزولی

خلفا اور امرا کی اطاعت کے بارے میں شریعت کی ان مختلف ہدایتوں کو پڑھتے ہوئے ذہن میں لازماً یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اصحابِ امر کی ممکنہ بے کرداریوں اور زیادتیوں کے تقاضے آیا صرف یہی کچھ ہیں جو ابھی بیان ہوئے، یا ان کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ کیا شریعت کی ہدایت صرف یہیں تک محدود ہے کہ اگر یہ لوگ ظلم و بربریت پر اتر آئیں تو اسے صبر سے برداشت کیا جاتا رہے، حتیٰ کہ اگر معصیت کا حکم دیں تب تو اس کی تعمیل نہ کی جائے، لیکن باقی معاملات میں ان کی اطاعت سے پھر بھی انکار نہ کیا جائے، یا اس کے آگے بھی اس نے کچھ فرمایا ہے؟ واضح تر لفظوں میں یہ کہ کیا بے کرداریوں اور زیادتیوں کی کسی حد میں داخل ہو جانے کے بعد سرے سے امارت اور خلافت کا استحقاق بھی ختم ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور کیا فکر و عمل کا کوئی بگاڑ ایسا بھی ہے جس میں مبتلا ہو جانا منصبِ خلافت سے معزول کر دیے جانے کا سبب بن جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب شریعت نے اثبات میں دیا ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے ہمیں ذرا تفصیل میں جانا ہوگا۔ یعنی پہلے اصولی طور پر اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ خلفا کے فکر و عمل میں بگاڑ کس کس نوعیت کا پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ جائزہ سامنے آنے پر ہی ان صورتوں کا واضح تعین ہو سکے گا جن کے پیش آ جانے کے بعد کوئی شخص خلافت کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اس جائزے کے لیے اگر آپ گہری نظر سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا کہ فکر و عمل کا بگاڑ حسب ذیل چھ نوعیتیں اختیار کر سکتا ہے:

۱۔ صاحب امر رعایا کے حقوق نہ ادا کرے، اور ان پر ظلم و ستم روا رکھے۔

۲۔ وہ لوگوں کو معصیت کے کاموں کا بھی حکم دینے لگے۔

۳۔ وہ بدکردار ہو جائے، احکامِ شرع کی علانیہ خلاف ورزی پر اُتر آئے، اور فسق و فجور کا ارتکاب کرنے لگے۔

۴۔ وہ دین کی اہم ترین عملی بنیادوں اور ضروری علامتوں، یعنی ارکانِ اسلام کا بھی تارک ہو جائے۔

۵۔ اسلام سے اس کا بُعد اس حد کو پہنچ جائے کہ وہ مملکت کے آئین و قانون کو بھی بدل ڈالے، اور اس میں غیر اسلامی عناصر کو لا داخل کرے۔

۶۔ وہ اسلام کے بنیادی عقائد تک سے پھر جائے، اور کفر اختیار کر لے۔

جہاں تک پہلے دو قسم کے بگاڑوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں شریعت کی ہدایت اوپر وضاحت سے بیان کی جا چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان خرابیوں کے باوجود متعلقہ شخص کی امارت کو چیلنج نہ کیا جائے گا، اور 'معروف' میں اس کی اطاعت بدستور لازم رہے گی۔

تیسری نوعیت کے بگاڑ کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی اصحابِ امر کی فاسقانہ حرکتوں سے تو مسلمان سخت بیزار رہے گا، اور ضروری ہے کہ بیزار رہے۔ لیکن ان کی امارت کو بدستور تسلیم کرتے رہنے سے انکار نہ کر سکے گا، اور نہ 'معروف' میں ان کی اطاعت سے دست کشی اس کے لیے جائز ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

......اَلا مَنْ وُلِّیَ عَلَیْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ یَاْتِیْ شَیْئًا مِّنْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ فَلْیَکْرَهْ مَا یَاْتِیْ

مِنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ. (مسلم،کتاب الامارۃ)

............"سن رکھو! جن لوگوں کے اُوپر کوئی حاکم مقرر کیا گیا ہو، اور وہ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتے دیکھیں جو معصیت کی حرکتیں ہوں، تو انھیں چاہیے کہ اس کی ان حرکتوں سے نفرت اور ناگواری رکھیں، لیکن ساتھ ہی اس کی اطاعت سے دست کشی ہرگز نہ اختیار کریں۔"

چنانچہ اس بارے میں علما کا اجماع ہے کہ فسق کے ارتکاب سے خلیفہ معزول نہیں ہو جایا کرتا، اور محض اس فسق کی بنا پر اس کے خلاف بغاوت کرنا صحیح نہیں، بلکہ حرام ہے۔

(شرح مسلم للنووی، کتاب الامارۃ)

اب چوتھی نوعیت کو لیجیے۔ اس قسم کے بگاڑ میں اگر صاحب امر مبتلا ہو جائے تو اس کے ساتھ مسلمان کس طرح پیش آئیں؟ آیا وہ اب بھی اس خلافت اور امارت کو تسلیم کرتے رہیں اور 'معروف' میں اس کی اطاعت کو اپنے لیے لازم سمجھیں، یا کوئی اور رویہ اختیار کریں؟ اس سوال کا جواب آپ کو ان حدیثوں سے ملے گا:

يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمُ الْأُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ .... قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلُّوْا. (مسلم، کتاب الامارۃ)

"تم پر امرا مقرر ہوں گے، جن کی کچھ باتوں کو تم پسندیدہ اور اچھی پاؤ گے اور کچھ کو ناپسندیدہ اور بری............ (صحابہؓ نے) پوچھا: "تو کیا اے اللہ کے رسولؐ! ایسی حالت میں ہم ان سے جنگ نہ کریں؟" فرمایا: "جب تک وہ نماز پڑھیں (اور اس کے تارک نہ بنیں) ایسا نہ کرنا۔"

............وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ............ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ فَقَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ. (مسلم، کتاب الامارۃ)

............"تمھارے بُرے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں...... پوچھا گیا: "اے اللہ کے رسول! تو کیا ہم ایسے خلفا کے ساتھ تلوار کا معاملہ نہ کریں؟" ارشاد ہوا: "نہیں، جب تک وہ تمھارے اندر نماز قائم کرتے رہیں ایسا نہ کرنا۔"

ان حدیثوں سے نماز کی حد تک تو، جو اسلام کے عملی ارکان میں سے سب سے پہلا اور سب سے اہم رکن ہے، بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، یعنی یہ کہ جو شخص نماز چھوڑ بیٹھے وہ مسلمانوں کا نہ کوئی چھوٹا حاکم رہ سکتا ہے نہ بڑا، نہ اس کی امارت برقرار رہ سکتی ہے نہ امامت اور خلافت۔ اس نے جہاں نماز سے بے تعلقی اختیار کی، مسلمانوں کو اس بات کا حق مل جائے گا، یا ان پر یہ ذمہ داری عائد ہو جائے گی کہ اسے معزول کر دیں، اور اگر وہ منصب چھوڑنے سے انکار کر دے تو تلوار کی نوک سے ہٹا کر دُور پھینک دیں۔ چنانچہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں علما کا اجماع ہے:

اجمع العماء علٰی ان الامامة لا تنعقد لکافر و علی انه لو طرٔ علیه الکفر انعزل و کذا لو ترک اقامة الصلوٰة و الدعا الیها. (شرح مسلم للنووی، جلد دوم)

''علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی کافر خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا، اور اگر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد متعلقہ شخص کبھی مبتلائے کفر ہو جائے تو خلافت سے فوراً معزول ہو جائے گا، اور ایسا ہی اس وقت بھی ہوگا جب وہ نماز کا قائم کرنا اور دوسروں کو اس کی تلقین و تاکید کرنا چھوڑ بیٹھے۔''

اب رہا باقی ارکان اسلام کا معاملہ، تو ان کے سلسلے میں ہمیں اس طرح کی کوئی واضح ہدایت کتاب و سنت کے اندر نہیں ملتی جیسی کہ نماز کے سلسلے میں ملتی ہے۔ البتہ بعض اصولی قسم کے ارشادات ایسے ضرور ملتے ہیں جن سے اس بارے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ:

وَعَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ فَبَايَعْنَا فَقَالَ فِيْمَا اَخَذَ عَلَيْنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ .... وَعَلٰى اَلَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَّاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ. (بخاری، جلد دوم، کتاب الفتن)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بلا کر بیعت لی۔ اس بیعت میں آپؐ نے ہم سے جن باتوں کا عہد لیا ان میں یہ باتیں داخل تھیں: یہ کہ ہم (امرا کے احکام) سنیں گے اور (ان کی) اطاعت کریں گے............ اور یہ کہ صاحب حکومت سے اقتدارِ حکومت کے

بارے میں کش مکش نہ کریں گے، سوائے اس وقت کے جب کہ ہم اس سے کھلا ہوا کفر دیکھ لیں، جس کے کفر ہونے پر ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔''

اس حدیث میں صاحب حکومت کے خلاف قدم اٹھانے کی اجازت دینے سے شریعت کا صرف اس وقت تک انکار ثابت ہوتا ہے جب تک کہ اس سے ''کھلا ہوا کفر'' صادر نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے جہاں ''کھلا ہوا کفر'' صادر ہوتے دیکھ لیا گیا اس کا استحقاق خلافت ختم ہوگیا۔ یہاں ایک بات قابل غور اور وضاحت طلب ہے، اور وہ یہ کہ یہاں 'کفر' سے مراد کیا ہے؟ کیا اس سے مراد صرف اعتقادی کفر ہے، یا اس میں عملی کفر بھی شامل ہے؟ اگر اس حدیث کے منشا پر غور کرتے وقت ان دونوں حدیثوں کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جو نماز کے سلسلے میں ابھی درج کی جا چکی ہیں، تو دوسری بات ہی قرین قیاس معلوم ہوگی۔ کیونکہ ان تینوں حدیثوں میں مسئلہ ایک ہی بیان کیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ کون سی حالت ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد منصبِ خلافت کا استحقاق چھن جاتا ہے؟ اس 'حالت' کو پہلی دونوں حدیثوں میں 'ترکِ نماز' کی حالت فرمایا گیا ہے، جب کہ اس آخری حدیث میں اس کے اظہار و بیان کے لیے'' کھلے ہوئے کفر'' (کفر بواح) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی حالت کی تعیین و توضیح کے لیے مختلف مواقع پر مختلف الفاظ لائے جائیں تو وہ صرف ظاہراً مختلف ہوں گے، معناً مختلف نہ ہوں گے۔ اور اگر ان میں معنی کا کوئی اختلاف ہوگا بھی تو صرف اجمال و تفصیل کا، یا جز اور کل کا ہوگا، نہ کہ اصل اور بنیاد کا۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخری حدیث میں ''کفر بواح'' سے مراد اعتقادی کفر کے علاوہ عملی کفر بھی ہے۔ کیونکہ ایک ہی حالت کے اظہار و بیان کے لیے ایک جگہ 'ترک نماز' کے الفاظ لانا اور دوسری جگہ کھلے ہوئے 'کفر' کے الفاظ کا استعمال کرنا اس حقیقت کا صاف اعلان ہے کہ ترک نماز بھی 'کفر بواح' کی ایک متعین شکل ہے۔ پھر چونکہ نماز پڑھنا ایک عمل ہے، عقیدہ نہیں ہے، اس لیے نماز کا قائم کرنا ایک 'فعل' کا ترک ہے، کسی 'عقیدے' کا ترک نہیں ہے۔ ایسی شکل میں ترکِ نماز کو بھی ''کفر بواح'' کہنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں کفر سے مراد کفر عملی بھی ہے۔ غالباً

یہی وجہ ہے کہ اس 'کفر بواح' کے لیے اِلَّا اَنْ تَسْمَعُوْا، (الا آں کہ تم سنو) یا اِلَّا اَنْ تَعْلَمُوْا (الا آں کہ تمھیں معلوم ہو) کے بجائے ''اِلَّا اَنْ تَرَوْا'' (الا آں کہ تم دیکھو) کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، تا کہ اس میں عملی کفر کا موجود ہونا پوری طرح نمایاں رہے۔

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ اس حدیث میں 'کفر' سے مراد کفر عملی بھی ہے، تو اب غور کرنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ کیا صرف نماز ہی ایک ایسا عمل ہے جسے چھوڑ بیٹھنے کو عملی کفر کہا جا سکتا ہے، یا دوسرے ارکان دین کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے؟ اس مسئلہ میں دونوں ہی رائیں ہو سکتی ہیں، 'ہاں' کی بھی اور 'نہیں' کی بھی۔ 'ہاں' کی اس لیے کہ قرآن اور حدیث سے ان اعمال کے چھوڑ بیٹھنے کو بھی عملی کفر سمجھا جا سکتا ہے، اور سمجھا گیا ہے۔ 'نہیں' کی اس لیے کہ جس صراحت کے ساتھ نماز کو کفر و اسلام کی حدِ فاصل اور اس کے چھوڑ دینے کو عملی کفر فرمایا گیا ہے، اتنی صراحت کسی اور رکن دین کے بارے میں قرآن یا حدیث کے اندر نظر نہیں آتی۔

اب پانچویں نوعیت کے بگاڑ کو لیجیے۔ مملکت کے اسلامی کردار کا تحفظ نہ کرنے والے اور اس کے آئین و قانون میں غیر اسلامی عناصر لا داخل کرنے والے خلیفہ کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اس بات کا فیصلہ بنیادی طور پر یہ آیت کرتی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ. (المائدہ:۴۴)

''جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے سو وہی کافر ہیں۔''

قرآن مجید کی یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ اسلامی قوانین کو چھوڑ کر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا 'عملی کفر' ہے۔ غور کیجیے، اگر اسلامی قوانین کو چھوڑ کر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا عملی کفر ہے تو مملکت کے آئین کو یا اس کے مجموعۂ قوانین کے کسی حصہ کو غیر اسلامی اصول و قوانین سے بدل کر رکھ دینا کیا کچھ نہ ہوگا؟ کوئی شک نہیں کہ اگر وہ عملی کفر ہے تو یہ شدید ترین عملی کفر ہوگا۔ 'عملی کفر' کا استحقاق خلافت کے معاملے پر جو اثر پڑتا ہے، اسے ہم ابھی جان چکے ہیں،

اور وہ یہ کہ اب یہ استحقاق باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لیے اس بگاڑ میں مبتلا ہو جانے والے کے بارے میں شریعت کا فیصلہ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسے صاحب امر کو امارت کی مسند سے اٹھا کر دُور پھینک دیا جائے۔ جیسا کہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ:

فلوطرٔ علیه کفر او تغییر للشرع اوبدعة خرج عن حکم الولایة وسقطت طاعة ووجب علی المسلمین القیامه علیه و خلعه و نصب امام عادل ان امکنهم ذالک. (شرح مسلم للنووی، کتاب الامارۃ)

''پس اگر خلیفہ کفر میں مبتلا ہو جائے، یا احکام شریعت کو بدل ڈالے، یا بدعت اختیار کر لے تو حکومت کرنے کا سزاوار نہیں رہ جاتا، اور مسلمانوں پر سے اس کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے اور ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، اسے معزول کر دیں، اور اس کی جگہ کسی اور عادل شخص کو مقرر کر لیں، اگر ان کے بس میں ہو۔''

امام نوویؒ قاضی صاحبؒ کے ان لفظوں کو نقل کرنے کے بعد —— اور اس نقل کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ موصوف کی رائے بھی یہی ہے —— مذکورہ بالا حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے ''لَامَا صَلُّوْا'' اور ''لَا مَا اَقَامُوْا فِیْکُمُ الصَّلٰوۃَ'' کا مدعا ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

فیه معنی ما سبق انه لا یجوز والخروج علی الخلفاء بمجرد الظلم اوالفسق ما لم یغیروا شیئًا من قواعد الاسلام. (شرح مسلم للنووی، کتاب الامارۃ)

''اس میں بھی وہی حقیقت بیان ہوئی ہے جو اُوپر مذکور ہو چکی، یعنی یہ کہ خلفا جب تک اسلام کے بنیادی اور قطعی احکام میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی جسارت نہ کریں اس وقت تک ان کے محض ظلم اور فسق کی بنا پر ان کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہ ہوگا۔''

ان توضیحات سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ اسلامی قوانین کو اگر کوئی خلیفہ غیر اسلامی قوانین سے کسی حد میں بھی بدل دیتا ہے تو اس کے بعد خود اسے بھی بدل دیا جانا چاہیے۔

اب آخری اور چھٹی نوعیت کے بگاڑ کے متعلق کچھ کہنا بالکل غیر ضروری ہوگا۔ جب 'عملی کفر'

ہی خلافت سے معزولی کو ضروری ٹھیرا دیتا ہے تو 'اعتقادی کفر' کے بعد اس میں کسی تامل کی گنجائش ہی کہاں رہ سکتی ہے؟ اسلام اور ایمان تو استحقاق خلافت کی سب سے پہلی، سب سے ضروری اور ہر طرح سے متفق علیہ شرط ہے۔ اگر کوئی شخص اس شرط پر پورا نہیں اترتا تو اس کے خلیفہ ہونے یا خلیفہ باقی رہنے کا سوال قطعاً خارج از بحث ہی نہیں بلکہ خارج از گمان بھی ہے۔ چنانچہ علما نے پورے اتفاق رائے سے فرمایا ہے کہ مسلمان ایسے شخص کو خلافت کے اقتدار پر قابض کسی حال میں بھی نہیں دیکھ سکتے جس نے اپنا رشتہ کفر سے جوڑ لیا ہو۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ:

انه ينعزل بالكفر اجماعا فيجب على كل مسلم القيامه في ذالک فمن قوى علىٰ ذالک .... فله الثواب و من داهن فعليه الاثم و من عجز وجبت عليه الهجرة من تلک الارض. (فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۱۰۱)

”خلیفہ کفر اختیار کر لینے پر خلافت سے معزول ہو جاتا ہے، اس پر اجماع ہے۔ اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ (جب ایسی صورت پیش آئے تو) اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے اس فریضے کو انجام دیے جائیں گے انھیں ثواب ملے گا، جو مداہنت برتیں گے وہ گناہ گار ٹھیریں گے، اور جو (ارادے اور کوشش کے باوجود اس مہم میں شریک ہونے سے) مجبور ہوں گے ان کے لیے ضروری ہوگا کہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔“

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اعمال وعقائد کے بگاڑ کی مذکورہ بالا چھ ممکن صورتوں میں سے پہلی تین کے اندر خلیفہ کے حق خلافت کو چیلنج کرنے کی شرعاً ممانعت[1] ہے، اور آخری تین صورتوں

---

[1] اس ممانعت کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ خلفا اور امرا کے ہر ظلم، ہر فسق اور ہر حکمِ معصیت کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جاتا رہے۔ بلکہ حقیقت اس سے بہت کچھ مختلف ہے۔ شریعت نے اگر خون خرابے کے بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے نتیجتاً ان چھوٹے مفاسد کو انگیز کر جانے کی ہدایت فرمائی ہے، تو ساتھ ہی اس بات کی بھی زبردست تلقین کی ہے کہ جب بھی اہل حکومت کی طرف سے اس طرح کی کوئی برائی سرزد ہوتی دیکھی جائے ان کی اصلاح کی پوری کوشش کی جائے، ان کے سامنے حق بات لائی جائے اور انہیں راہ راست پر لانے کی ہر وہ پرامن تدبیر لازماً اختیار کی جائے جو اختیار کی جاسکتی ہو۔ اوپر حضرت عبادہؓ بن صامت کی جو حدیث بَايَعْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ الخ گزر چکی ہے، اس کے باقی الفاظ یہ ہیں: ”وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَانَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ“ (باقی صفحہ ۹۸ پر)

میں اسے معزول کر دینے کی ہدایت ہے۔

یہ بات کہ بگاڑ کی ان تین صورتوں میں امام کی معزولی کیوں ضروری ہو جاتی ہے، غالباً کسی بحث اور دلیل کی محتاج نہیں۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں بتایا جا چکا ہے، اسلام اور اہلِ اسلام کو حکومت کا نظام بجائے خود مطلوب نہیں ہے، بلکہ بعض اہم مصالح اور عظیم مقاصد کے حاصل کرنے کا وہ محض ایک لازمی ذریعہ ہے، اور ان مصالح و مقاصد میں سے بھی اولین اور بنیادی اہمیت شرعی قوانین کے نفاذ کو حاصل ہے۔ اب اگر اس حکومت کا سربراہ خدانخواستہ اسلام ہی سے برگشتہ ہو جاتا ہے تو اس سے عام نظم و نسق کے چلانے کی توقع تو ضرور باقی رکھی جا سکتی ہے، لیکن یہ توقع خواب و خیال میں بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے اختیار و اقتدار کو، اپنی فکری اور عملی قوتوں کو، اور اپنی منصبی کارکردگی کو اس مطلوب کے حاصل کرنے میں صرف کرے گا جسے اسلام اپنے نظامِ مملکت کے قیام کی بنیادی غایت قرار دیتا ہے۔ اس کے بخلاف پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی ساری طاقت اس کے خلاف ہی استعمال کرے گا۔ اس لیے کوئی شک نہیں کہ اس کے ہاتھوں سے زمامِ خلافت کا چھین لینا عین منشائے اسلام ہوگا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال باقی دونوں صورتوں میں بھی پیش آ سکتی ہے، اور ایک حد تک تو لازماً پیش آ کر رہے گی۔ جو شخص دین سے اس حد تک بے نیاز ہو چکا ہو کہ اس کی اہم ترین عملی بنیادوں سے بھی کوئی لگاؤ نہ رکھتا ہو، اور شریعت

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۷) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جہاں خلفاء و امراء کی اطاعت کی اور ان کے منصبی اقتدار کو چیلنج نہ کرنے کی بیعت لی، وہیں اس امر کی بھی بیعت لی کہ، خواہ کوئی موقع ہو کلمۂ حق کہنے سے باز نہ آئیں گے۔

کلام کا یہ انداز اور سیاق صاف بتاتا ہے کہ غلط کار امراء کے بارے میں مسلمانوں کا جو رویہ ہونا چاہیے وہ صرف اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ان کی امارت کے خلاف قدم اٹھانے سے باز رہیں، معروف میں ان کی بدستور اطاعت کرتے رہیں اور ان کے ظلم و فسق پر صبر کریں، بلکہ اس کی حدیں ابھی اور آگے جاتی ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے ظلم و فسق پر انہیں ٹوکیں بھی اور ان کے حکم معصیت پر انہیں قیامت سے ڈرائیں بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو اس بات کی بار بار تلقین فرمائی ہے کہ جس طرح عام لوگوں کے بارے میں منکر سے روکتے رہنا مسلمان کا فریضہ ہے اسی طرح امراء و حکام کی غلط اور خلاف شرع حرکتوں پر نکیر کرنا، اور اگر اس کی جرأت نہ ہو تو ان پر دل سے نفریں بھیجنا اس کے مومن ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

کے قوانین کو منسوخ کر دینے میں بھی اسے کوئی باک نہ محسوس ہوتا ہو، اس سے یہ امید ہرگز نہیں رکھی جاسکتی کہ خلافت کے اصل مقصد کا وہ سچے دل سے وفادار رہے گا؟ اس سے یہ تو شاید ممکن ہو کہ ملک کو وہ اقتصادی حیثیت سے دولت کا گھر، اور سیاسی حیثیت سے دنیا کا لیڈر بنا دے، مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اسے بندگی رب کا گہوارہ اور خیر و صلاح کا مرکز باقی رکھے گا، اور اس کے عام شہری اس کی رہنمائی میں نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے، معروف کی تلقین کرنے والے اور منکر سے روکنے والے بن سکیں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو بالکل واضح بات ہے کہ ایسے شخص کو اپنے اجتماعی نظام کا بدستور ذمہ دار بنائے رکھنا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کو امن وحفاظت کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں۔

معزولی کے مسئلے پر تمدنی ارتقا کا اثر

مملکت کے حکمران کو معزول کب اور کس طرح کیا جائے؟ واضح طور پر یہ سیاسی نظم کا مسئلہ ہے، اور سیاسی نظام کا حال یہ ہے کہ اس کے بہت سے ضابطے اور طور طریقے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعیین میں تمدنی حالات کا بھی بہت کچھ دخل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ایک سی حالت پر نہیں رہتے۔ جب تک ملک کا تمدن ابتدائی منزل میں ہوتا ہے، اس کا حکومتی اور سیاسی نظام بھی بہت مختصر اور سادہ ہوتا ہے، اور اس نظام کے اصول وضوابط بھی اپنے اندر بڑی محدودیت رکھتے ہیں۔ پھر جوں جوں تمدن آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست کے ضابطے اور طور طریقے بھی بدلتے جاتے ہیں، اور مملکت کا نظام زیادہ اصول پسندانہ، زیادہ ترقی یافتہ، زیادہ وسیع اور زیادہ منضبط ہوتا جاتا ہے۔

اسلام ایک عالمی دین اور ابدی نظام حیات ہے، اس لیے حرکت اور نمو اس کی فطرت میں داخل ہے۔ تمدنی ارتقا کا وہ نہ صرف یہ کہ ساتھ دینا چاہتا ہے بلکہ اس کی رہنمائی اور نگرانی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی منصبی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اسلام کی یہ صلاحیت اور اس کی یہ حیثیت چاہتی ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور تمدن کی پھیلتی ہوئی ضرورتوں کو وہ ہمیشہ نگاہ میں

رکھے، اور اپنے نظامِ سیاست کے اُن ضابطوں اور طور طریقوں کو نیا آب و رنگ، بلکہ نئی شکل و صورت دیتا رہے جو بنیادی احکام اور اصولی ہدایات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اگر ایسے سیاسی ضوابط کو زمانے کی فراہم کی ہوئی آسانیوں کے مطابق بنالیا جائے تو یہ کوئی 'بدعت' نہ ہوگی، بلکہ عین 'سنت' ہوگی، اسلام سے تجاوز نہ ہوگا، بلکہ عین منشائے اسلام ہوگا۔

خلفا کی معزولی کا مسئلہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کیونکہ کسی خلیفہ کو کب تک خلیفہ باقی رکھنا چاہیے اور کب اور کس طرح ہٹا دیا جانا چاہیے، یہ بات قطعی طور پر سیاست کے انھی ضوابط میں شامل ہے جن کے تعین میں تمدنی حالات اور زمانے کے تقاضے بھی دخل رکھتے ہیں، اور جن کو دینی نظام میں اصول کی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ ان میں کبھی کوئی تغیر ہو ہی نہ سکے۔ اس لیے آج جب کہ دنیا کے تمدنی اور اجتماعی حالات، بارہ تیرہ صدی پہلے کے مقابلے میں کافی بدل چکے اور آگے بڑھ چکے ہیں اور حکومتوں کی تبدیلی میں بڑی آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں، یہ ایک اہم سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا خلفا کی معزولی اب بھی صرف انھی تین حالتوں اور شکلوں تک محدود رہے گی جن کی اوپر کی بحث میں نشان وہی کی گئی ہے، یا بگاڑ کی باقی تین صورتوں میں سے بھی کسی صورت میں اس راستے کو اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال کے جواب پر موقوف ہے، اور وہ یہ کہ کیا لوگوں کی جان و مال کا تحفظ اور ان کے حقوق کی نگہداشت اسلامی ریاست کے مقاصد میں شامل ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات ہی میں ہوگا، اور اس بارے میں ہرگز کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کے سامنے آ جانے کے بعد پہلے سوال کا جواب بھی پردے میں نہ رہ جائے گا، اور وہ آپ سے آپ معلوم ہو جائے گا۔ یعنی یہ کہ آج حکومتوں کو بدلنے کے جو پر امن جمہوری طریقے رائج ہو چکے ہیں، ان سے کام لے کر اسلامی مملکت کے سربراہ کو اقتدار کی مسند سے اُس وقت بھی ہٹا دیا جا سکتا ہے، بلکہ ہٹا دیا جانا ضروری ہوگا، جب کہ وہ رعایا پر ظلم کرتا دیکھا جائے، یا فسق و فجور میں آلودہ نظر آئے، یا معصیت کے کاموں کا بھی حکم دیتا پایا جائے۔ کیونکہ اس طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہو جانے کے بعد اس سے یہ توقع رکھنا بوالفضولی سے کم نہ ہوگا کہ اس

کے ہاتھوں لوگوں کی جان و مال کا تحفظ ہو سکے گا، ان کے حقوق کی نگہداشت ہو پائے گی، ان کے ذہنوں کو بدی اور بے کرداری کی شہ نہ ملے گی، اسلامی ریاست کی حرمت داغ دار نہ ہوگی، اور اس کے جملہ مقاصد اچھی طرح پورے ہوتے رہیں گے۔ پھر ایسے شخص کو معزول کرنے اور اس کے شر سے دین وملت کو محفوظ کر لینے کی طاقت اور سہولت رکھنے کے باوجود خلافت کی ذمہ داریاں بدستور اسی کے سپرد کیے رکھنا کوئی معقول بات کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا شریعت کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان روا رکھا جاسکتا ہے کہ نظامِ خلافت کے مقاصد کو تو نقصان پر نقصان پہنچ رہا ہو، مگر وہ اپنے پیرووں کو اس صورت حال کے ازالے کی راہ اختیار کرنے سے روکتی رہے گی، حالانکہ وہ صاف کھلی دکھائی دے رہی ہو؟

اس سلسلے میں ان حدیثوں کے الفاظ سے کوئی الجھن یا غلط فہمی نہ ہونی چاہیے جن میں سے بعض کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں، اور جو اس امر کی واضح ہدایت دیتی نظر آتی ہیں کہ جب تک خلیفہ ترکِ نماز کا یا کھلے ہوئے کفر کا مرتکب نہ ہو اس کے خلاف قدم اٹھانا ممنوع ہے۔ بلاشبہ ان احادیث سے ہمیں یہی ہدایت ملتی ہے۔ لیکن یہ ہدایت جس مصلحت کی بنا پر دی گئی ہے۔ اسے نظر انداز کر کے ان احادیث کا اصلی منشا اور ظالم و فاسق امرا کے بارے میں شریعت کا حقیقی نقطۂ نظر پوری طرح ہرگز نہ سمجھا جاسکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس مصلحت کو معلوم کر لیا جائے۔ اس غرض کے لیے امام نوویؒ کا یہ واضح بیان بالکل کافی ہوگا:

اجمع اهل السنة انه لا ينعزل السلطان بالفسق .... قال العلماء و سبب علام العزل و تحريم الخروج عليه ما يترتب علٰى ذالک من الفتن واراقة الدماء و فساد ذات البين فتكون المفسدة في عزله اكثر منها في بقائه۔ (شرح مسلم، کتاب الامارۃ)

"اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حکمران، فسق کی بنا پر معزول نہیں ہو جاتا........... علما فرماتے ہیں کہ اس معزول نہ ہو جانے اور ایسے حکمران کے خلاف کسی بغاوت کے حرام

ہونے کی وجہ وہ فتنہ وفساد، خون خرابہ اور وہ باہمی کشاکش ہے جو اس اقدام کے نتیجے میں برپا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے معزول کر دینے کی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہو جانے والی یہ خرابی اس کے خلیفہ باقی رہنے کی خرابی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔"

یہ تو فاسق امرا کا مسئلہ رہا۔ ٹھیک اسی طرح کی بات علمانے ظالم امیروں کے بارے میں بھی فرمائی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جو شخص بھی اسلام سے واقف ہوگا، وہ اس کے سوا اور کوئی مصلحت اس ممانعت کی سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس بات کو ایک حقیقت تسلیم کر لینے میں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے کہ بگاڑ کی جن صورتوں میں امرا کے خلاف اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے، صرف بدامنی، خانہ جنگی اور خون ریزی کے اندیشے ہی کی بنا پر منع کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ ممانعت مطلق ہمہ گیر اور ابدی قطعاً نہیں ہے۔ گویا صورت واقعہ یہ ہے کہ شریعت کے نزدیک یہاں دو ناگزیر بلاؤں میں سے ایک کو لازماً اختیار کرنے کا معاملہ تھا: یا تو صاحب امر کے ظلم اور فسق کو گوارا کیا جائے، یا پھر اسے طاقت کے زور سے ہٹائے جانے کی شکل میں خانہ جنگی اور خون خرابے کے عذاب کو برداشت کیا جائے۔ اس نے دوسری بلا کو، جیسا کہ عقل سلیم چاہتی ہے، زیادہ سخت اور پہلی کو اس کے مقابلے میں کم سخت قرار دیا، اور اس لیے یہ ہدایت دی کہ اسے کلیجے پر پتھر رکھ کر انگیز کیا جائے، اور اس کے ازالے کے لیے قائم شدہ حکومت کے خلاف قدم اٹھا کر مملکت کو نراج کی، اور عام مسلمانوں کو قتل وغارت کی بھینٹ چڑھ جانے کی بدتر مصیبت کو مول نہ لیا جائے۔ جب کہ 'کفر عملی' یا 'کفر اعتقادی' کی حیثیت اس کے نزدیک اس کے برعکس تھی۔ کیونکہ امرا کی خرابیاں اور ضلالتیں خلافت کے مقاصد کو صرف نقصان ہی نہیں پہنچاتیں، بلکہ ان کا گلا گھونٹ دینے والی ہوتی ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ مقاصد مسلمان کے خون سے کم نہیں، زیادہ قیمتی ہیں۔ اس لیے یہ بلا شریعت کی نظر میں زیادہ سخت، اور اس کے مقابلے میں بدامنی اور خون خرابے کی بلا کم سخت ٹھیری تھی۔ جس کا فطری تقاضا یہی تھا کہ اس کے رُونما ہو جانے کی شکل میں وہ صاحب امر کے خلاف اقدام کی ممانعت کو واپس لے لیتی۔

اب جب کہ یہ بات ایک حقیقت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آ چکی کہ ظالم اور فاسق امرا کے خلاف قدم اٹھانے کی ممانعت صرف خانہ جنگی اور خوں ریزی کی مصیبت سے بچنے کے لیے کی گئی ہے، تو اسے بھی ایک حقیقت ہی ماننا پڑے گا کہ جہاں عملاً اس مصیبت کے برپا ہو جانے کا اندیشہ موجود نہ ہو وہاں یہ ممانعت بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ اور اگر ہنگامے اور خون خرابے کے بغیر ہی حکومت کو بدل دینے کا موقع حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں ظالم و فاسق حکمرانوں کو منصبِ حکومت پر باقی رکھنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اس وقت عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا صرف یہ ہوگا کہ انھیں اپنے منصب سے لازماً ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ:

نقل ابن التین عن الداؤدی قال الذی علیه العلماء فی امراء الجور انه ان قدر علٰی خلعه بغیر فتنة ولا ظلم وجب والاّ فالواجب الصبر.

(فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۶)

''ابن التین نے داؤدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ظالم امرا کے بارے میں علما کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انھیں کسی فتنے اور ظلم کے بپا ہوئے بغیر معزول کیا جا سکتا ہے تو ایسا کر ڈالنا واجب ہے، ورنہ واجب یہ ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔''

اسی طرح امام نوویؒ بعض دوسرے علما کی یہ وضاحت نقل کرتے ہیں کہ:

اما قوله "اِصْبِرُوْا" فذالک حیث یلزم من ذالک سفک الدماء او اثارة الفتنة و نحو ذالک. (مسلم، کتاب الایمان)

''رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''صبر سے کام لو'' تو اس کا تعلق ایسے حالات سے ہے جب کہ (امیر کے خلاف) اس (اقدام) سے خوں ریزی یا فتنہ وفساد یا اسی طرح کی کوئی اور بلائے عام پھوٹ پڑنے والی ہو۔''

غرض ظالم اور فاسق امرا کی معزولی کے بارے میں علمائے اسلام کا، جیسا کہ چاہیے، عام خیال یہی ہے۔ بلاشبہ آج سے ہزار بارہ سو برس پہلے کیا، ابھی ماضی قریب تک کے زمانوں میں بھی، صورتِ حال بالعموم یہی تھی کہ حکومتوں کی جبری تبدیلی آسان نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ اُس

وقت اس طرح کی ہر کوشش ملکی امن و امان کو آگ لگا دینے کے ہم معنی تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم اور فاسق حکمرانوں کے معاملے میں تلقین بھی قدرتی طور پر، صبر و تحمل ہی سے کام لینے کی فرمائی۔ لیکن اس وقت اگر یہ صورت حال باقی نہیں رہ گئی ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ اس تلقین وہدایت پر عمل کرنے کا موقع و محل بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ زمانے میں ووٹوں کے ذریعے سے حکومت کے سربراہ منتخب کرنے کا، اور پھر بوقت ضرورت معزول کر دینے کا جو جمہوری طریقہ رائج ہو چکا ہے، اس سے کام لینا عین طریق اسلام اور عین تقاضائے دین ہوگا۔ جہاں بھی اس طریقے سے کام لینے کی آسانیاں حاصل ہوں، مسلمانوں کے اہلِ حل و عقد کا یہ فرض ہوگا کہ اس سے ضرور کام لیں۔ جب بھی ان کا امیر منصب خلافت کی ذمہ داریاں صحیح طریقے سے پوری کرنے میں ناکام ثابت ہو اسے علیحدہ کر دیں، اور اس کی جگہ کسی اہل شخص کو لا مقرر کریں۔ کیونکہ اس طریقے سے حکومت کو بدل لینے میں فتنے، بدامنی اور خوں ریزی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں دو بلاؤں ——— ظالم اور فاسق حکمران کو گوارا کرتے رہنے کی بلا، یا خانہ جنگی اور خون خرابے کی بلا ——— میں سے کسی ایک کو لازماً اختیار کرنے کا معاملہ ہے ہی نہیں کہ خون خرابے کی بلا کے مقابلے میں ظالم حکمران کے وجود کی بلا کو انگیز کرتے رہنے کا سوال پیدا ہو۔

پھر ضرورت صرف اسی بات کی نہیں ہے کہ خلیفہ جب کسی غلط کاری کا مظاہرہ کرے تو پارلیمنٹری طریق پر اسے امارت کے منصب سے ہٹا دیا جائے، بلکہ اس بات کی بھی ہے کہ چاہے اس کی طرف سے کسی ظلم یا کسی فسق یا اسی طرح کی کسی اور اہم غلط کاری کا مظاہرہ نہ ہوا ہو، پھر بھی اس کے سلسلۂ امارت کے جاری رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں ایک معقول مدت کے بعد لوگوں کی رائیں معلوم کی جاتی رہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ موجودہ امیر سے چاہے کوئی قابل لحاظ کوتاہی سرزد نہ ہوئی ہو کہ اس کا ہٹا دیا جانا ضروری ہو، مگر بہت ممکن ہے کہ اس مدت میں ملت کے اندر سے کوئی اور شخصیت ابھر کر سطح پر آ گئی ہو جس کی صلاحیتوں پر لوگوں کو نسبتاً زیادہ اعتماد ہو، اور انھیں یہ

توقع ہو کہ اگر موجودہ امیر کی جگہ اس شخص کو خلافت کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں تو وہ انھیں زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکے گا۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ حکومت کو بدل نہ دیا جائے، اور محض اس بنا پر کہ ایک شخص کو پہلے اس منصب کے لیے منتخب کیا جا چکا ہے اور اس کی خلافت منعقد ہو چکی ہے، دوسرے افراد کی بہتر صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ یہاں جو کچھ اہمیت ہے، خلافت، خلافت کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریوں کی ہے، کسی شخصیت کی اور اس کے کسی حق کی نہیں ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہ اسلام میں حکومت اور امارت اصلاً صرف ذمہ داری ہے، حق ہے ہی نہیں۔ اس لیے اگر کسی شخص کو خلافت کے منصب سے ہٹایا جاتا ہے تو اس سے اس کا کوئی حق نہیں چھنتا کہ وہ اس کی شکایت کرے۔ بلکہ اس کے سر سے ایک بھاری ذمہ داری اتار لی جاتی ہے، اور وہ بھی صرف اس لیے کہ شریعت کے منشا اور خلافت کے مقصد کا تقاضا تھا۔

نظامِ خلافت کی وحدت

چونکہ نظامِ خلافت کی ضرورت، اہمیت اور نوعیت، سب کچھ اصلاً دینی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام تر دینی ہے، اس لیے اسلامی آبادیوں (دارالاسلام) کی حدیں چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو جائیں، سارے مسلمانوں کا خلیفہ اور امام ایک ہی ہوگا، اور مختلف خطوں میں الگ الگ حکومتیں اور خلافتیں قائم کر لینا صحیح نہ ہوگا۔ علامہ ماوردی لکھتے ہیں کہ:

لایجوز ان یکون للامة امامان فی وقت واحد. (الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۷)

''یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں اُمت کے دو خلیفہ ہوں۔''

اس بارے میں بعض اکے دکے افراد کو چھوڑ کر پوری امت یک رائے ہے۔ امام نووی کے بقول:

اتفق العماء علٰی انہ' لا یجوز ان یعقد لخلیفتین فی عصر واحد سواء اتسعت دارالاسلام ام لا. (شرح مسلم، کتاب الامارۃ)

''علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالاسلام کی حدیں چاہے وسیع ہوں یا غیر وسیع، ایک ہی زمانے میں دو دو آدمیوں کی خلافت کا قیام جائز نہیں۔''

شریعت نے اس اصول کو بڑی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کے نزدیک وہ شخص گردن زدنی ہے جس کے ہاتھوں پر ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے خلافت کی متوازی بیعت کرلی گئی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ:

اِذَا بُوْیِعَ لِخَلِیْفَتَیْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا. (مسلم، کتاب الامارۃ)

''اگر خلافت کی بیعت دو آدمیوں کے ہاتھوں پر کرلی جائے تو بعد والے شخص کو قتل کردو (اگر اس کی نام نہاد خلافت کا فتنہ کسی طرح ختم نہ ہو سکے)۔''

غرض 'وحدت' اسلامی نظامِ سیاست کا ایک مسلّم اور بڑا اہم اصول ہے۔ اسلام اُمت کے لیے بیک وقت ایک سے زائد اجتماعی نظاموں کے وجود کو پوری شدت کے ساتھ رد کرتا ہے۔ ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ اس کے مزاج کا تقاضا تو تھا ہی، اس کے مشن کا، اور اس کے خلافتی نظام کے مقاصد کا بھی تقاضا یہی تھا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے معلوم ہو چکا، اسلام نے اپنے پیروؤں کو خلافت کا نظام قائم کرنے کی ہدایت اس لیے نہیں دی ہے کہ اس طرح دنیا کے سیاسی مطلع پر وہ بھی نمایاں رہیں گے، یا ان کی حوصلہ مند شخصیتوں کو اپنے جذبۂ حکمرانی کی تسکین کا موقع مل جائے گا، یا ان کے مختلف وطنی اور نسلی گروہ اپنے اپنے قومی 'انا' کو بلند کرنے کی خواہش پوری کرلیں گے۔ اس کے بخلاف اس نے یہ ہدایت صرف اس لیے دی ہے تاکہ وہ خود حکمران بن کر رہے، انسانی زندگی پر اس کی اور اس کی پیرو ملت کی، دشمنوں سے حفاظت ہو، اور اس کے غلبہ واقتدار کی حدیں پھیلتی رہیں۔ ایسی حالت میں اگر پوری امت مسلمہ ایک گروہ، ایک قوم اور ایک سیاسی وحدت ہونے کے بجائے متعدد سیاسی وحدتوں میں بٹی رہے، اور اس طرح پورا دارالاسلام عملاً مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں تقسیم ہو جائے، تو یہ اسلام کے قومی ہونے کی نہیں بلکہ کمزور ہونے کی علامت ہوگی۔ یہ امت کے شیرازہ بند اور متحد رہنے کی نفی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی رسی کے علاوہ کچھ اور بھی رشتے ہیں جو اس کے حلقوں میں اتحاد واجتماع کا مرکز ہونے کی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں، اور اب یہ ملت اندر سے پھٹ چلی ہے۔ اس لیے کفر

وضلال کے مقابلہ میں تن واحد نہ ثابت ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ان مقاصد کو غیر معمولی نقصان پہنچائے گی جن کی خلافت کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلام نے بجا طور پر اس بات کی اجازت نہیں دی کہ مسلم دنیا، پوری کی پوری ایک ہی اسٹیٹ ہونے کے بجائے کئی اسلامی مملکتوں کی ''کامن ولتھ'' بھی بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس اس نے ضروری قرار دیا کہ ایک ہی مشن کی علم بردار اُمت کو سیاسی طور پر بھی ایک ہی اُمت اور ایک ہی قوم رہنا چاہیے۔

رہا یہ سوال کہ پوری اُمت کے سیاسی طور پر بھی ایک ہی اُمت اور ایک ہی قوم بن کر رہنے کی انتظامی شکل کیا ہوگی؟ یعنی اس کا حکومتی نظام وحدانی قسم کا ہوگا، یا وفاقی؟ تو اس بارے میں دین کا عام مزاج، اس کی اجتماعی ہدایتوں کا رُخ، مقاصدِ خلافت کا مفاد اور خیر القرون کا طرزِ عمل، سب کے سب وحدانی طرزِ حکومت ہی کا فیصلہ دیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم اس امرِ واقعی کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے کہ اس ''فیصلے'' کا تعلق لازماً ایک ایسی صورت حال سے ہے جب کہ سارے مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے ہوں اور ان کا سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہو۔ یا جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے نہ ہونے کے باوجود ان کے ایک ہی حکومتی نظم ونسق کے تحت رہنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر صورت حال یہ نہ ہو، یعنی سارے مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے نہ ہوں، یا یہ سارے علاقے آپس میں ملے ہوئے تو ہوں مگر ان میں سے بعض ایسے بھی ہوں جو غیر مسلموں کے محکوم ہو چکے ہوں اور اس وجہ سے آزاد وخود مختار مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں کٹ کر رہ گئے ہوں، تو ایسی صورتوں میں اس 'فیصلے' پر اصرار نہ کیا جا سکے گا۔ یہ نہ صرف عملی ضرورت ہی کا تقاضا ہے بلکہ بعض نصوص سے بھی ہمیں اسی طرح کی رہنمائی ملتی ہے۔

قبیلۂ عبدالقیس جب اسلام کا حلقہ بگوش ہوا تو اس کے ایک وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

''اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے وطن اور آپؐ کے وطن کے درمیان مضر کے کفار حائل ہیں۔

اس لیے ہم جب چاہیں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایتیں نہیں لے سکتے، بلکہ صرف حرمت کے خاص مہینوں ہی میں اس کا موقع مل سکتا ہے، اس لیے آپ ہمیں (ضروری) ہدایتیں اور احکام دے دیجیے، تاکہ ہم ان پر عمل کرتے رہیں اور پھر واپس جا کر دوسروں کو ان کی دعوت دیں۔"

آپؐ نے وفد کی گزارش کے جواب میں جو کچھ فرمایا اور جن امور کی تلقین کی ان میں سے ایک یہ بھی تھا:

وَاَنْ تُوَدُّوْا خُمُسَ مَا غَنِمْتُمْ. (مسلم، جلد اول، کتاب الایمان)

"تمھیں غنیمت کا جو مال ملے، اس کا پانچواں حصہ ادا کرتے رہنا۔"

غور کیجیے، اس ارشاد کا ذہنی پس منظر کیا رہا ہوگا؟ یقیناً یہی کہ یہ لوگ قبائل مضر کے کفار سے اپنی صواب دید کے مطابق جہاد کرنے کے مجاز ہوں گے، اور مرکزِ اسلام سے انھیں اس کے لیے بروقت حکم دیا جانا ضروری نہ ہوگا۔ حالانکہ کسی بھی وحدانی نظامِ حکومت میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ملک کے کسی حصے میں کوئی جنگی کارروائی مقامی ذمہ دار اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ مرکز کی طرف سے انھیں ہدایت موصول ہو چکی ہو۔ اس لیے قبیلہ عبدالقیس کو آپؐ نے بطور خود جنگی اقدامات کرتے رہنے کی جو منظوری عطا فرمائی، اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ حالات اگر رکاوٹ ڈال رہے ہوں تو اسلامی مملکت کا نظام وحدانی طرز کے بجائے وفاقی طرز کا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قبیلۂ مذکور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح کا اختیار، اور وہ بھی صلح و جنگ جیسے اہم مسائل میں دے دیا تھا وہ اختیار و مرتبے میں ان اختیارات سے کسی طرح کم نہ تھا جو کسی وفاقی نظام میں صوبائی حکومتوں کو حاصل ہوا کرتے ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اصل اور معیاری طرزِ حکومت تو وحدانی طرز ہی ہے، لیکن مصالح کے پیشِ نظر وفاقی طرز کو بھی اپنایا جا سکتا ہے۔

ملّی انتشار میں دینی تقاضے

نظمِ اجتماعی کی بحالی کی ضرورت

اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک منظم اجتماعی زندگی جس حد تک ضروری ہے، اور جس لیے ضروری ہے، پچھلے مباحث نے ہم پر یہ بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔ لیکن اس دنیا میں کوئی گروہ ہمیشہ اپنی مطلوبہ حالت ہی میں باقی و کارفرما نہیں پایا گیا ہے۔ اس لیے یہ ملت بھی ایسے حالات سے دوچار ہو سکتی ہے جب وہ اپنی اس ضروری ہیئتِ اجتماعیہ سے محروم ہو چکی ہو، جب وہ ایک منظم اور منضبط جماعت رہنے کے بجائے افراد کی بس ایک بھیڑ بن گئی ہو، جس میں نہ کوئی شیرازہ بندی ہو نہ کوئی اجتماعی حرکت ہو، اور اس لیے عملاً اس کا وہ مقصد بھی باقی نہ رہ گیا ہو جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی ——— جیسا کہ آج ایک مدت سے اس کا یہی حال فی الواقع ہو بھی چکا ہے ——— ایسی صورت حال کے بارے میں یہ کہنا کہ اسلام کے نزدیک وہ سخت ناپسندیدہ بلکہ ناقابل برداشت ہے، ایک غیر ضروری بات ہوگی۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اسی صورت حال کے بارے میں یہ بات کہ پھر اس شکل میں افرادِ ملت کو کرنا کیا چاہیے، اتنی واضح اور روشن نہیں ہے۔ اس لیے نظری اور عملی، ہر حیثیت سے ضروری ہے کہ اس اہم ترین سوال کا صحیح جواب معلوم کیا جائے۔

پہلے اس سوال کا عقلی جواب متعین کیجیے۔

اوپر کے سارے مباحث ہمارے سامنے ہیں۔ ان مباحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ اجتماعیت ——— انتہائی ٹھوس، منظم اور منضبط اجتماعیت ——— اسلام کے لیے فطرتاً مطلوب، اور عملاً ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نہ امتِ مسلمہ، اُمتِ مسلمہ بن کر رہ سکتی ہے، نہ اسلام نوعِ انسانی کو وہ

سب کچھ دے سکتا ہے جسے دینے کے لیے وہ آیا ہے۔ اس کے بے شمار احکام جن کا تعلق انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل تک سے ہے، صرف کتابت اور تلاوت کے لیے وقف ہو کر رہ جاتے ہیں، اور عملی دنیا میں ان کے نافذ اور قابل اتباع ہونے کی کوئی شکل بن ہی نہیں سکتی۔ یہ سب کچھ ہم واضح اور قطعی دلائل کی روشنی میں دیکھ چکے ہیں۔ اب غور کیجیے کہ عقل ان ساری باتوں کا تقاضا کیا ٹھیراتی ہے؟ یہی، یا اس کے سوا کچھ اور، کہ یہ ملت 'بھیڑ' سے پھر 'جماعت' بنے، ایسی جماعت جس میں نظم واتحاد ہو، یک رنگی و یک حرکتی ہو، اور جسے ''الجماعۃ'' کہہ سکیں، اور جو اپنے مقصد وجود کو پورا کرنے کے قابل ہو سکے؟ کوئی شک نہیں کہ عقل کا فیصلہ اور تقاضا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد اس سوال کا شرعی جواب معلوم کیجیے، اور یہی جواب فی الواقع اصل جواب ہوگا:

اس غرض سے ہم جب کتاب الٰہی اور سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے قرآن حکیم کی یہ ہدایتیں آتی ہیں:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا .... وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا. (آل عمران: ۱۰۲-۱۰۳)

''اے ایمان والو! اللہ کی رسی کو تم سب کے سب مضبوط پکڑ لو اور علیحدہ علیحدہ نہ رہو۔''

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً. (بقرہ: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! (اللہ اور رسولؐ کی) اطاعت میں تم سب کے سب داخل ہو رہو۔''

پہلی آیت کا منشا زیر بحث مسئلہ کے خصوص میں بالکل واضح ہے۔ وہ براہ راست یہی ہدایت دیتی ہے کہ سارے مسلمانوں کو متحد و منظّم رہنا چاہیے، اور ضروری ہے کہ اللہ کی رسی انھیں باہم مضبوطی سے جوڑے ہوئے ہو۔ رہی دوسری آیت، تو بالواسطہ وہ بھی اسی فریضے کی تلقین کر رہی ہے۔ کیوں کہ ایک ایک فرد مسلم کا اللہ اور رسولؐ کی کلی اور غیر مشروط اطاعت میں اپنے آپ کو دے دینا اس بات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہنے دے سکتا کہ ملت پھر بھی غیر منظم حالت میں رہ

جائے۔ سارے کے سارے مسلمان اگر دین حق کو اپنی زندگیاں حوالے کر دیں ——— اس دین حق کو، جو معاشرے کے لیے ایک منظم جماعتی زندگی گزارنا ضروری قرار دیتا اور اس کے لیے سمع و طاعت کے تفصیلی احکام دیتا ہے ——— تو اس کا حاصل لازماً یہی ہوگا کہ مسلم معاشرہ ''سیسہ پلائی ہوئی دیوار'' بن جائے۔ اس لیے آیت کا منشا بالواسطہ یہ بھی ہے کہ ملت اگر پوری طرح متحد و یک رنگ نہ ہو تو لازماً متحد و یک رنگ ہو جائے۔

یہ ہدایتیں عام اور ہمہ گیر ہدایتیں ہیں۔ یہ کسی خاص حالت، یا کسی خاص وقت، یا کسی خاص مقام و ماحول کے لیے کسی طرح بھی مخصوص نہیں، جب بھی، اور جہاں کہیں بھی، مسلمانوں کا کوئی چھوٹا یا بڑا گروہ موجود ہوگا، وہ ان ہدایات کا مخاطب ہوگا، اور ضروری ہوگا کہ وہ انھیں سنے اور اپنے مقدور بھر اُن پر عمل کرے۔ ان آیتوں کے اندر کوئی معمولی سا بھی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ خیال کیا جا سکتا ہو کہ یہ ہدایتیں صرف صحابہ کرامؓ کے لیے تھیں۔ اس لیے ان احکام خداوندی کے مخاطب و مکلّف ہر دَور کے مسلمان ہوں گے، چاہے وہ پہلی صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ اُمت مسلمہ 'حبل اللہ' کے شیرازے میں پوری طرح کسی بندھی تھی، چاہے اس چودھویں صدی ہجری کے مسلمان ہوں جب کہ اس شیرازے کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان احکام کا خطاب جتنی اہمیت اور شدت کے ساتھ اُس دَورِ نظم و اتحاد کے مسلمانوں سے تھا، اس سے کہیں زیادہ اہمیت اور شدت کے ساتھ اس دَورِ افتراق و انتشار کے مسلمانوں سے ہوگا۔ کیونکہ ان احکام کی عملی حیثیت و اہمیت اُن کے لیے تو فی الواقع ایک تلقین احتیاط سے کچھ ہی زیادہ تھی، جب کہ ان کے لیے حکم اور وصیت سے بھی بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ ایک نڈھال مریض کے لیے تندرست آدمیوں کے مقابلے میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ بہر حال کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

کلام اللہ کے بعد کلامِ رسولؐ کی طرف آیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اختلاف و انتشار کی حالت کا براہِ راست تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدُ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ

الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ تَمَسَّکُوْا بِھَا وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ.

(ابوداؤد، جلد دوم، کتاب السنۃ)

"جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ امت میں بہت سارے اختلافات برپا ہوتے دیکھیں گے۔ ایسے وقت میں تمھارے لیے ضروری ہوگا کہ "میری سنت" اور میرے برسرِ ہدایت اور پیروِ حق "خلفا کی سنت" کو مضبوطی سے تھامے اور دانتوں سے پکڑے رہو۔"

ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک جامع اور اصولی ہدایت ہے۔ یہ ایک ایک مسلمان کا شانہ پکڑ کر تلقین کرتی ہے کہ دیکھو، اُمت میں جب بھی، اور جس طرح کا بھی، کوئی اختلاف رونما ہو اس وقت "رسولِ خدا کی سنت" اور "خلفائے راشدین کی سنت" پر مضبوطی سے جم جانا، ورنہ اس کے سوا کوئی روش نہ ہوگی جو تمھارے لیے صحیح ایمانی روش کہی جاسکے۔

اس حدیث میں "سنت" کے لفظ کا مفہوم کیا ہے؟ پہلے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں اس لفظ کا وہ محدود مفہوم نہیں ہے جو ایک فقہی اصطلاح کی حیثیت سے اس کا ہوا کرتا ہے، اور جو عام طور سے معروف و متعارف ہے۔ اس حقیقت کی سب سے واضح دلیل خود اسی حدیث کے لفظوں میں موجود ہے۔ اس حدیث میں صرف "عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ "وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ" کے الفاظ بھی ہیں یعنی اختلافات کے وقت "سنت رسولؐ" کے ساتھ ساتھ "خلفائے راشدین" کی سنت کو بھی دانتوں سے پکڑے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فقہی اصطلاح میں جس چیز کو سنت کہتے ہیں اس کا اطلاق صرف انھی باتوں پر ہوسکتا ہے جن کا تعلق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال سے ہو، نہ کہ ان باتوں پر بھی جن کا تعلق اصلاً خلفائے راشدین یا کسی اور صحابی کے اقوال اور اعمال اور اجتہادات سے ہو۔ اس لیے اس حدیث میں 'سنت' کا وہی وسیع مفہوم ہے جو ازروئے لغت اس لفظ کا ہونا چاہیے، یعنی طریقہ اور روش، جیسا کہ بے شمار حدیثوں میں یہی مفہوم اس لفظ کا لیا گیا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں جب بھی اس لفظ کو استعمال فرمایا ہے، اکثر و بیشتر اسی معنی و

مفہوم میں استعمال فرمایا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت نبی کے، اور خلفائے راشدین نے بحیثیت خلفائے راشدین کے، زندگی کے جس معاملے میں بھی جو کچھ کیا ہے وہ سب آپؐ کی اور حضرات خلفائے راشدین کی 'سنت' ہے۔ خواہ اس کا تعلق عبادتی امور، معاشرتی آداب اور تمدنی طور طریقوں سے ہو، خواہ سیاست و اجتماع کے وسیع تر مسائل سے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ارشاد نبویؐ کا مدعا یہی قرار پائے گا کہ میں تمھارے سامنے دین کی پیروی، اس کی اقامت، اور اس کے جملہ تقاضوں کی انجام دہی کے سلسلے میں جو کچھ کر رہا ہوں، اور میرے بعد میری ہی پیروی میں خلفائے راشدین جو کچھ کریں گے، تمھارا فرض ہوگا کہ تم بھی وہی کچھ کرنا، خصوصاً جب اُمت میں اختلافات سر اٹھالیں، اس وقت تو اس امر کی ضرورت اور شدید ہو جائے گی۔

غور فرمایئے، اُمت کا اجتماعیت سے محروم ہو رہنا کون سی حالت ہے؟ کیا یہ حالتِ اختلاف نہیں؟ بلاشبہ یہ حالتِ اختلاف ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے کی حالت ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے جس کے اظہار و بیان کے لیے اگر کوئی تعبیر موزوں ہو سکتی ہے تو صرف یہی کہ یہ بے شمار اختلافات کی پیدا کی ہوئی آخری بدترین حالت ہے۔ اس لیے اگر کسی ایک اختلاف کے رُونما ہو جانے پر آپؐ کی اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی 'سنت' کو دانتوں سے پکڑ لینا ضروری ہے تو بے شمار اختلافات کا بدترین نتیجہ سامنے آچکنے پر اس ہدایت کی پیروی یقیناً ضروری سے ضروری تر ہو جائے گی۔

اب آیئے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی سنت، اس طرح کے کسی معاملے میں کیا رہی ہے؟ یا کم از کم یہ کہ اصولاً کیا ہو سکتی تھی؟

اس سلسلے میں جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا تعلق ہے، آپ کی کوئی ایسی سنت، اور طریق کار تو ہم پا ہی نہیں سکتے جس کا ملی پراگندگی کی حالت سے براہ راست تعلق ہو۔ کیونکہ آپؐ کے مبارک دَور میں اس نامبارک حالت کے پائے جانے کا کوئی عملی امکان تھا ہی نہیں۔ اس

لیے آپؐ کے اسوہ اور آپؐ کی 'سنت' میں اس بات کی تلاش بھی بے وجہ اور فضول ہی ہوگی کہ ملی انتشار اور بے نظمی کی کسی حالت میں آپؐ نے کیا کیا تھا؟ آپؐ کا سارا کام صرف ایک نئی امت کی تشکیل تھا۔ اس لیے ملی انتشار کے مواقع کے لیے ہمیں جو رہنمائی مل سکتی ہے وہ آپؐ کے اسی اسوہ اور طریق کار سے ماخوذ رہنمائی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس غرض کے لیے بھی ہمیں صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ اُمت کی تشکیل آپؐ نے کس طرح کی تھی؟ پھر جو کچھ، اور جیسا کچھ آپ کو ہم اس سلسلے میں کرتا ہوا پائیں گے اسی سے اُمت کی تنظیم جدید کے لیے بھی کسبِ ہدایت کریں گے، اور یہی حالتِ اختلاف میں آپؐ کی 'سنت' کو مضبوطی سے پکڑنا ہوگا۔ یہ بات کہ آپؐ نے اُمت کی تشکیل کس طرح کی تھی، کسی تفصیلی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہر واقف حال جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات کو کافی نہیں قرار دے لیا تھا کہ لوگ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کا اقرار کرلیں اور پھر اپنے اپنے طور پر نماز روزہ ادا کرتے رہیں، بلکہ آپؐ کی دعوت کے لوازم و مضمرات اس سے بہت آگے تک کے تھے۔ آپؐ نے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کا جو مفہوم اپنے عمل سے قرار دیا وہ یہ تھا کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرتا، اس کی زندگی آپ سے آپ ایک مضبوط تنظیم کا جز بن جاتی اور آپؐ ایسے تمام افراد کو اجتماعیت کے رشتے میں اس طرح پروئے جاتے جس طرح تسبیح کے دانے پروئے جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مدنی دور کے کئی برسوں تک اسلام لانے والوں کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آجائیں۔ گویا ذہنی اور عملی طور ہی پر ان کا ایک منظم گروہ بنتے جانا کافی نہ تھا، بلکہ حالات کے تحت اس وقت ظاہری اور جسمانی طور پر بھی ان کا ایک محاذ پر آکر جمع ہو جانا تقاضائے دین وایمان تھا۔ یہ حکم آپؐ نے اس وقت تک واپس نہیں لیا جب تک کہ اسلام سیاسی طور پر پوری طرح مضبوط نہ ہو گیا، اور اس بات کا کوئی واقعی خطرہ باقی نہ رہ گیا کہ کفر وشرک کی طاقتیں اس کے قیام میں مانع ہو سکتی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد، جب حالات اس طرح کے ہو گئے، تب جا کر آپؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب کسی شخص کو اپنے وطن سے منتقل ہو کر مدینہ آنے کی ضرورت نہیں رہی، جو جہاں ہو وہیں رہ کر نظامِ ملی کا جز بنا رہے اور اپنے انفرادی فرائض

کے ساتھ اجتماعی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوتا رہے۔(لا ھِجْرَۃَ بَعْدَ الْفَتْحِ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق کار کو سامنے رکھ کر قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ اگر آپ کو ملی افتراق وانتشار کی کسی حالت سے سابقہ پیش آیا ہوتا تو آپ کی سنت اس وقت بھی یہی ہوتی۔ یعنی آپ اس حالت انتشار کو حالتِ نظم واتحاد سے بدل ڈالنے کی کسی ممکن اور موزوں کوشش سے کبھی نہ جھکتے۔ اس لیے آپ کے اس طریق کار کا اقتضا یہی ہوگا کہ ملت اسلامیہ جب بھی اختلاف و انتشار سے دو چار ہو، اس کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہوگی کہ اپنی اس حالت کو اتحاد و تنظیم کی حالت سے لازماً بدل ڈالے۔

''سنتِ رسولؐ '' کے بعد ''سنتِ خلفائے راشدینؓ'' کی طرف آیئے۔ چونکہ دورِ خلافت کا معاملہ دورِ نبوت کے معاملے سے فطری طور پر مختلف تھا، اور اس میں ملی اختلاف و انتشار کا پیدا ہو جانا عملاً ممکن تھا، چنانچہ ایک حد تک وہ پیدا ہوا بھی، اس لیے خلفائے راشدین کی 'سنت' سے ہمیں اس مسئلے میں براہِ راست رہنمائی مل سکتی ہے۔

سلسلۂ خلافت کی سب سے پہلی کڑی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اور نہ صرف یہ کہ وہ اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ہیں، بلکہ آپ ہی کی 'سنت' ہمیں سب سے واضح رہنمائی بھی مہیا کر رہی ہے، اسی لیے اسی کا جائزہ لینا اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مناسب اور مفید رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب آپ امت کے سربراہ مقرر ہوئے تو عرب کے بعض قبائل، جو حلقہ اسلام میں داخل چلے آ رہے تھے، ادائے زکوٰۃ کے معاملے میں حکم عدولی پر اتر آئے، اور انہوں نے حکومت کو مالِ زکوٰۃ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ صورت حال اتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی تھی کہ فاروق اعظمؓ جیسا ''اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ '' بھی کوئی سخت قدم اٹھانے کو صحیح نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے قبائل کے اس رویے کو برداشت کر لینے کے لیے دین میں کوئی گنجائش نہیں پائی، اور پوری عزیمت واستقامت کے ساتھ صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا کہ:

"خدا کی قسم! اگر ان لوگوں نے اونٹ باندھنے کی کوئی ایک رسی بھی، جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے، میرے حوالے کرنے سے انکار کیا تو میں ان سے اس کے لیے جنگ کروں گا۔" (مسلم، جلد اول)

اس اعلان کے لفظ لفظ کو اچھی طرح غور سے دیکھیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے زکوٰۃ نکالنا بند کر دیا تو میں ان سے جنگ کروں گا، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان لوگوں نے اپنی زکوٰۃ کی رقم میرے (یعنی اسلامی حکومت کے) حوالہ کرنے سے انکار کیا تو مَیں ان سے اس کے لیے جنگ کروں گا۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے نزدیک بجائے خود یہ بات بھی جنگی اقدام کو ضروری قرار دے دیتی ہے کہ لوگ حکومت کے بیت المال میں اپنی زکوٰۃ داخل کرنے سے انکار کر دیں، چاہے اپنی جگہ زکوٰۃ کے نکالنے اور بطور خود اسے مستحقین پر تقسیم کر دینے میں وہ کسی کوتاہی کو روا نہ رکھتے ہوں۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ یہ واضح طور پر اسلامی نظامِ اجتماعی کا مسئلہ تھا۔ زکوٰۃ روک لینے والوں کا طرز عمل اُس نظام میں ایک رخنہ ڈال رہا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ کا یہ اعلان جنگ اس نظام کو اسی رخنے سے محفوظ رکھنے کے لیے تھا۔ اس لیے آپ کے اس طرز عمل سے آپ کی سنت یہ متعین ہوئی کہ ملی نظام اجتماعی میں پیدا ہونے والے کسی بھی خلل کو برداشت نہیں کیا جا سکتا، اور ہر قیمت پر اس کی روک تھام یا اس کا ازالہ ضروری ہے۔

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کی یہ مزید تفصیل موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے آپ کو جب یہ مشورہ دیا کہ:

يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تَاَلَّفِ النَّاسَ وَارْفُقْ بِهِمْ.

"اے خلیفۂ رسولؐ! ان لوگوں سے ملے جڑے نظر آئیے اور نرمی کا رویہ اختیار کیجیے۔"

تو آپ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کے الفاظ یہ تھے:

"عمرؓ! زمانۂ جاہلیت میں جہاں تم اتنے سخت تھے وہاں اب اسلام میں اتنے بودے بن رہے ہو! کوئی شک نہیں کہ وحی کا سلسلہ موقوف، اور اللہ کا دین مکمل ہو چکا ہے۔ کیا اب وہ

میرے جیتے جی ناقص ہو رہے گا؟"   (مشکوٰۃ، باب مناقب ابی بکرؓ)

حضرت ابوبکرؓ کے ان لفظوں سے زیرِ بحث مسئلے میں ایک اور پہلو سے رہنمائی ملتی ہے۔

آپ کے یہ الفاظ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ دین کے مطالبات میں سے اگر کوئی ایک مطالبہ بھی پورا کرنے سے انکار کیا جا رہا ہو تو آپ کے نزدیک یہ دراصل دین، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل کیا جا چکا ہے، ناقص ہو کر رہ جاتا ہے، اور مومن و مسلم ہونے کی شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ صبر و سکون سے اس صورتِ حال کو برداشت کر لیا جائے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس دینی مطالبے پر عمل کرنے، عمل کرانے اور دین کامل کو ناقص ہو رہنے کے خطرے سے محفوظ کر لینے کو وقت کا ایک اہم ترین فریضہ بنا لیا جائے۔ گویا دین کو ناقص بنائے جاتے وقت یا اس کے ناقص بنا دیے جانے کی شکل میں خلیفۂ رسولؐ کی 'سنت' یہ ہوئی کہ اسے اس کی اصل حالتِ کمال پر باقی رکھنے یا اس کی طرف واپس لے جانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اب سوچیے، شیرازۂ ملت کا بکھر جانا اور "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" جیسے بنیادی مطالبۂ دین کا فراموش ہو کر رہ جانا دین کے ناقص ہو رہنے کی بات ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ اگر چند قبائل کا حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرنا دین کے ناقص ہو رہنے کے ہم معنیٰ ہے، تو پوری اُمت کا سرے سے بے امام و بے نظام بن جانا، اور بے شمار احکامِ شریعت کا معطل ہو رہنا یقیناً دین کے ناقص ہی نہیں بلکہ ناقص تر اور اپاہج بن جانے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ اگر حقیقت یہ ہے تو اس کی موجودگی میں آنجنابؐ کی 'سنت' کی پیروی صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملت کو پھر سے شیرازہ بند کیا جائے، اور اس کی کھوئی ہوئی منظم زندگی اسے واپس دلا دی جائے۔

ایک دوسرا ارشادِ نبوی ملاحظہ ہو:

اِنَّ الدِّیْنَ بَدَءَ غَرِیْبًا وَّیَرْجِعُ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ سُنَّتِیْ.   (ترمذی جلد دوم۔ صفحہ ۹۲)

"دین کا آغاز 'غربت' کے عالم میں ہوا تھا، اور ایک وقت چل کر وہ پھر اسی عالم میں لوٹ

جائے گا۔ تو مبارک ہو ان 'غربا' کے لیے جو اس وقت میری 'سنت' میں کی اُن چیزوں کو پھر سے درست کریں گے جنھیں لوگوں نے بگاڑ رکھا ہوگا۔"

اس حدیث میں اُمت کی آئندہ بگڑی ہوئی حالت کی خبر دیتے ہوئے جن لوگوں کو خوش بخت اور قابل مبارک باد فرمایا گیا ہے، غور کیجیے وہ کون اور کن صفات کے لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنت' اور طریقے کے ان اجزا کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کریں گے جنھیں غافلوں اور بدعملوں کے ہاتھوں نے بگاڑ رکھا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں آئندہ کی ایک خبر دینے سے زیادہ دراصل ایک وصیت فرمائی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی آپ کی 'سنت' کے کسی جز پر آنچ آئے، صاحب احساس مسلمان اس کی حفاظت یا بحالی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے اور اللہ کا بندہ بن کر رہنے کا جو طریقہ آپ چھوڑ گئے ہیں اس کے کسی ایک حصے کو بھی بے پروائی کے ساتھ حوادث زمانہ کی نذر ہو جانے دینا ایمان کی موت ہے، چاہے قانون (فقہ) کی نگاہ میں اس کی اہمیت چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ جہاں تک اللہ کی بندگی اور رسولؐ کی پیروی کا تعلق ہے، آپ کی ہر 'سنت' 'سنت' ہے، اور آپؐ کا قائم کیا ہوا کوئی ایک نقشِ قدم بھی نہیں جسے مومن کی نگاہ مٹا یا مٹتا ہوا دیکھ سکے۔

یہاں پھر اسی سوال کو سامنے لائیے، اور سوچیے کہ کیا ملت کے بند بند کا اکھڑ جانا اور اس طرح شریعت کے بے شمار احکام کا معاملات زندگی سے بے تعلق ہو کر رہ جانا دین کا کوئی معمولی فساد، اور سنت وطریقِ رسولؐ کا کوئی چھوٹا موٹا بگاڑ ہے؟ یقیناً نہیں۔ یہ بگاڑ تو اتنا بڑا اور اتنا مہلک ہے کہ اس سے زیادہ بڑے اور مہلک بگاڑ کا دین وسنت رسولؐ کے بارے میں تصور بھی مشکل ہے۔ پھر سب سے بڑے اور مہلک بگاڑ کے سلسلے میں، وصیت نبویؐ کا حق کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے؟ یعنی ان لوگوں کے کرنے کا کام کیا ہوگا جو صحیح معنوں میں اسلام کے پیرو ہوں، اور جن کو 'غربا' کا خطاب مل سکتا ہو؟ بلاشبہ اس سوال کا بھی ایک ہی جواب ہوگا، اور وہ یہ کہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے درست کرنے، اور اس کے مطلوبہ نظمِ اجتماعی کو از سرِ نو قائم کر ڈالنے کی فکر ہر فکر

پر غالب ہو جائے، اور اس کی خاطر ہر وہ جدوجہد کی جائے جو کی جا سکتی ہو۔

قرآن وسنت کے بعد اگر ہم فقہی اور کلامی اصولوں سے بھی دیکھنا چاہیں تو اس بارے میں، جیسا کہ ہونا چاہیے، اس سے مختلف کوئی چیز نہ پائیں گے۔ چنانچہ گزشتہ ابواب میں "نظم مملکت کی دینی ضرورت" کے زیر عنوان ائمۂ اسلام کی یہ تصریحات آپ کے سامنے آ ہی چکی ہیں کہ قیام خلافت کے واجب ہونے پر اُمت کا اجماع ہے، اور اس قیام خلافت کی ضرورت علامہ تفتازانی کے لفظوں میں اس لیے ہے کہ بہت سے واجباتِ شرعیہ کی بجا آوری اسی چیز پر موقوف ہے۔ (لانّ كثيرا من الواجبات الشرعية يتوقف عليه) یہ دونوں حقیقتیں اگر نا قابل انکار ہی ہوں گی کہ یہ دونوں ایک تیسری حقیقت کا وجود ضروری ٹھیراتی ہیں، اور وہ یہ کہ اگر امت میں اجتماعیت اور تنظیم باقی نہ رہ گئی ہو تو اس کا فرض ہوگا کہ اسے پھر سے اپنے اندر قائم کرے۔ کیونکہ یہی اجتماعیت اور تنظیم وہ چیز ہے جس پر خلافت و امامت کا قیام موقوف ہے۔ اگر دیواروں کے بغیر چھت نہیں بنائی جا سکتی تو نظم اجتماعی کے بغیر نظم خلافت بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ مانا ہوا اصول ہے کہ وہ کام بھی فرض بن جاتا ہے جس پر کسی فرض کا ادا ہونا موقوف ہو۔ بہت سے دینی احکام کی بجا آوری ایک امام کے تقرر پر موقوف ہے، اور امام کا تقرر امت کے شیرازہ بند ہونے پر منحصر ہے۔ اس لیے پہلی بات کا ضروری ہونا دوسری کے ضروری ہونے کی دلیل بن گیا، اور جب دوسری ضروری ہو گئی تو اس سے تیسری کا بھی ضروری ہونا آپ سے آپ لازم آ گیا۔

نظم اجتماعی کی بحالی کا طریقہ

یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے قدرتی طور پر یہ سوال آ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کام کا صحیح طریقہ کیا ہوگا؟ یہ امت، جو ایک بھیڑ کی شکل اختیار کر چکی ہے، پھر 'الجماعۃ' کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اسے اس کی کھوئی ہوئی منظم اجتماعیت واپس کیسے مل سکتی ہے؟ یہ سوال بجائے خود تو کافی اہم تھا ہی، مگر موجودہ صورت حال نے اسے اور زیادہ اہم اور ساتھ ہی سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ یہ سوال

اگر چہ ایسا فطری اور عملی سوال تھا جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے ذہن میں برابر موجود چلا آ رہا ہے اور اس لیے اس کا جواب بھی برابر سوچا جاتا رہا ہے، لیکن اس سوچ بچار کے سلسلے میں اب تک عام طور پر جو کچھ سنا اور دیکھا گیا ہے وہ سخت نا تسلی بخش ہی نہیں بلکہ بجائے خود اختلاف و انتشار کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔ جس کے نتیجے میں مسئلہ بہت کچھ الجھ بھی گیا ہے۔ اس لیے اس پر ہمیں پوری توجہ سے غور کرنا ہوگا۔

اس غور و فکر کی ابتدا کرتے وقت تین بنیادی اور مسلم حقیقتیں ہمارے ذہنوں میں بالکل واضح رہنی چاہییں۔

ایک تو یہ کہ اُمت مسلمہ کو ضرورت، جیسا کہ ''اسلامی اجتماعیت'' کی بحث میں تفصیل سے بتایا جا چکا، کسی مجرد اور بے قید اجتماعیت کی نہیں ہے، بلکہ اس کو ایک مخصوص قسم کی اجتماعیت اور وحدت مطلوب ہے، جس کا شیرازہ صرف 'اللہ کی رسی' ہو اور جس کے وجود کا مقصد شہادت حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت دین کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

دوسری یہ کہ جس طرح منظم اجتماعیت کی بحالی ایک دینی ضرورت ہے، اسی طرح اس بحالی کا طریقہ بھی 'دینی' ہی ہونا چاہیے۔ یعنی اس طریقے کا تعین صرف کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کریں گی، نہ کہ زید و بکر کے فلسفے اور نظریے، یا غیر اسلامی تحریکوں کے تجربے اور سنتیں۔

تیسری یہ کہ ہم جس طرح اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنت' سے کوئی راست اور صریح ہدایت نہیں پا سکے کہ ملی انتشار کی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، اسی طرح اس بارے میں بھی نہیں پا سکتے کہ جو کچھ کرنا ہے اسے کس طرح کرنا چاہیے؟ اور یہاں بھی وجہ ٹھیک وہی ہے جو وہاں تھی۔ یعنی یہ کہ اس وقت اُمت کی جس حالتِ اختلاف کو سامنے رکھ کر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ اس حالت سے بہت مختلف ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کام کرنا پڑا تھا۔ ہمارے سامنے ایک ایسی مسلمان ملت کی اصلاح و تنظیم نو کا مسئلہ ہے جو پہلے سے موجود چلی آ رہی ہے جب کہ رسول اللہؐ کے سامنے مسئلہ ایک نئی امت کی تشکیل کا تھا۔ اس لیے نظم اجتماعی کی بحالی کا کام کرنے

کے لیے اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور طریق کار میں کوئی ہدایت مل سکتی ہے تو وہ آپؐ کے اسوہ سے اخذ کی ہوئی ہدایت ہی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بات یہیں تک نہیں رہتی، بلکہ اس کے تقاضے اور آگے تک پہنچتے ہیں۔ دونوں حالتوں کے اُس فرق کی وجہ سے، جس کا ذکر ابھی ہوا، اگر زیر بحث حالت کے لیے صریح اور راست رہنمائی اسوۂ نبوی سے نہیں مل سکتی تو خود قرآن مجید سے بھی نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ قرآن حکیم کی وہ مخصوص نوعیت ہے جو اُسے خالص علمی کتابوں سے ممیز کرتی ہے۔ علمی کتابوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے تعلق رکھنے والی تمام ممکن باتوں اور حالتوں کو ایک ایک کر کے لیتی ہیں، اور ان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کو اس بات سے بہت کم بحث ہوتی ہے کہ اس وقت ان کے مخاطب کے عملی مسائل حیات کیا ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو ان کا کوئی متعین مخاطب بھی نہیں ہوتا، اور وہ بالکل تصورات کی دنیا میں اپنے فلسفے بگھار رہی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ کی کتاب انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر اسے فلاح کی منزل تک پہنچانے کے لیے آئی تھی، اس کا ایک متعین مخاطب تھا، اور ایک متعین مشن۔ وہ جو کچھ کہتی ضرورت وقت کے تقاضے ہی پر کہتی۔ اس لیے اس نے اُمت مسلمہ کو نظم و اجتماعیت کے ہتھیاروں سے مسلح کرنے کے سلسلے میں ہدایتیں دیتے وقت اگر ایک نئی اُمت کی تشکیل ہی کے مسئلے کو سامنے رکھا، اور پہلے سے موجود کسی پراگندہ مسلمان ملت کو ذہن میں رکھ کر صراحتاً کوئی بات نہیں فرمائی، تو اسے ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔

ان تینوں واضح اور مسلم حقیقتوں کو ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی 'سنت' پر نظر ڈالیے، اور یہ دیکھیے کہ ان کی رُو سے ملت کی نئی تنظیم کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

قرآن مجید نے امت مسلمہ کی تشکیل کے وقت سے متحد و منظم کرنے کے بارے میں جو بنیادی ہدایتیں دی تھیں، ان کا تعارف پچھلے اوراق میں، ''اسلامی اجتماعیت'' کے زیر عنوان، پوری تفصیل سے گزر چکا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایتوں کی تعمیل کس طرح کی تھی۔ یہاں ان ساری چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس اہم سوال پر غور کیجیے کہ

ملت کی تنظیم جدید کے مسئلے میں ان قرآنی ہدایتوں کی اور اس نبوی طریق عمل کی اصولاً کیا حیثیت ہوگی؟ آیا ان ہدایتوں کا اطلاق اس معاملے پر بھی ہوگا یا نہیں؟ اور اگر ہوگا تو کس حد تک؟

اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہمیں قرآن مجید کی ان ہدایتوں کے الفاظ اور انداز بیان کا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق عمل کی داخلی نوعیت کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا، اور گہری نظر ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ ایک خاص صورت حال سے متعلق ہونے کے باوجود ان کے اندر عموم کی شان پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یعنی ان کی حیثیت بنیادی طور پر عام اور اصولی ہدایات کی ہے یا حقیقتِ واقعی اس کے برعکس ہے؟ یہ جائزہ ہمیں اس کا جواب واضح طور پر اثبات میں دے گا۔ کیونکہ متعلقہ آیتوں میں ہم اس طرح کا کوئی اشارہ بھی نہیں پاتے جس سے یہ محسوس کیا جاسکے کہ قرآن کی یہ ہدایتیں بنیادی طور پر صرف نبی کے ذریعے سے بننے والی ایک نئی اُمت کی تشکیل و تنظیم ہی سے تعلق رکھتی ہیں، اور اگر اس کے بجائے پہلے سے موجود مسلمان ملت کی اصلاح، تعمیر اور تنظیم کا مسئلہ سامنے ہو تو اس کے لیے کوئی اور طریقہ اپنانا چاہیے۔ اس کے بخلاف ہم صاف دیکھتے ہیں کہ ان آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں کی کوئی بات بھی ایسی نہیں جو مسلم اصولی ہدایت کی شان نہ رکھتی ہو۔ حتیٰ کہ ان میں خطاب کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بالکل عمومی ہے۔ یعنی بات یوں نہیں فرمائی گئی ہے کہ:

اے نبی! اُمت مسلمہ کی تشکیل و تنظیم ان بنیادوں پر کرو، یا اے اصحاب نبیؐ! تمھیں ان خطوط پر اپنے کو سنوارنا اور منظم کرنا چاہیے، بلکہ یوں فرمائی گئی ہے کہ

> "اے اہل ایمان! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو ـــــــــ اور تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔"

کیا یہ اس حقیقت کا واضح قرینہ نہیں کہ "اہل ایمان" کو اپنی تنظیم کا فریضہ ہمیشہ انھی خطوط پر انجام دینا چاہیے، چاہے وہ اس وقت کے "اہل ایمان" ہوں جب کہ اُمت کی تشکیل ہو رہی تھی، چاہے بعد کے کسی دور کے "اہل ایمان" ہوں جب کہ ملت کے منتشر ہو جانے کے باعث اس کی

تنظیم جدید کی ضرورت درپیش ہوگی۔

عقلی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کے نتیجے میں بھی کوئی دوسری بات نہ پائی جائے گی۔ کیونکہ معاملہ چاہے تشکیل اُمت کے وقت کی تنظیم کا ہو، چاہے بعد کی تنظیم کا، یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ جب مقصد ایک ہی ہے، تو صرف اتنی سی بات ہے کہ ایک کے ارکان باہر سے چھانٹ چھانٹ کر اکٹھے کیے جاتے ہیں اور دوسری کے 'اندر' ہی سے بلائے جاتے ہیں، کام کے طریقوں میں کون سا بنیادی فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں، جہاں تک افراد کے اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کا تعلق ہے، اس 'اندر' اور 'باہر' کی بنا پر فرق ضرور واقع ہو جائے گا، اور ایک غیر مسلم کے مقابلے میں ایک بے عمل مسلمان کے حقوق بھی بہر حال کہیں زیادہ ہوں گے، خواہ اس دعوتِ تنظیم کے جواب میں اس کا رویہ معاندانہ ہی کیوں نہ ہو۔ بس یہی ایک فرق ہے جو دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ فرق اپنی جگہ بڑا عظیم فرق ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تنظیم ملت کے بنیادی اصولوں پر وہ کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اثر انداز ہونا تو الگ رہا، اس فرق کا اس مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں دکھائی پڑتا۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھیے، ملت کی تنظیم جدید کا طریقہ بھی بنیادی طور پر وہی ہوگا جو اُمت مسلمہ کی تشکیل کے متعلق قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ میں پایا جاتا ہے، اور وہ ان نکات پر مشتمل ہوگا:

(۱) کام کی ابتدا 'رجوع الی الحق' کی دعوت عام سے کی جائے۔ پوری قوت سے ملت کی خود شناسی کو ابھارا جائے، اسے یاد دلایا جائے کہ وہ اس زمین کی سطح پر کس کام کے لیے موجود ہے، اور جس دین سے اپنی وابستگی کا دعویٰ رکھتی ہے وہ اس کے افراد کو کن صفات سے آراستہ، اور اسے اجتماعی طور پر کس مقدس مہم میں مشغول دیکھنا چاہتا ہے۔ اس 'نفیر عام' کے جواب میں اس کے جو افراد شعور کے ساتھ لبیک کہہ کر آگے بڑھیں، انھیں بتایا جائے کہ تمھارے آقا و مولیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو، اور اس کی رضا کے سوا تمھارے سامنے اور کوئی چیز ایسی نہ

رہ جائے جس پر تمھاری نگاہیں ٹک سکیں۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران:۱۰۲)

(۲) جو لوگ 'رجوع الی الحق' کی اس دعوت کو فکری طور پر اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول کرلیں، اور عملی طور پر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے پر تیار ہو جائیں، انھیں بتایا جائے کہ اپنے جس بھولے ہوئے مقصد کو تم پھر سے اپنا رہے ہو وہ ایک عظیم مقصد اور ایک دشوار مہم ہے۔ تم اسے سر کرنے کے قابل اس وقت تک ہرگز نہیں بن سکتے جب تک کہ تم سب ایک تنظیم، ایک وحدت، اور ایک بنیان مرصوص نہ بن جاؤ۔ اس کے علاوہ تمھارے مومن و مسلم ہونے کا فطری تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لیے تمھارا الگ الگ 'متقی' اور 'مسلم' بن جانا ہی کافی نہ ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ تم سب مل کر ایک ایسی منظم جماعت بن جاؤ جو اپنے اجتماعی وجود میں بجائے خود بھی ایک ''مومن، متقی اور مسلم'' وجود ہو۔ اس طرح جو لوگ ایک منظم جماعت کی شکل اختیار کر لینے کے لیے تیار ہوں ——— اور اگر وہ اپنے 'رجوع الی الحق' کے فیصلے میں مخلص ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے لیے تیار نہ ہوں ——— انھیں اس تنظیم کا جزو ترکیبی بنانے والی چیز 'حبل اللہ' (یعنی اللہ کے دین) اور 'دخول فی السلم' (یعنی کامل اطاعت) کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کو اس تنظیم میں ہرگز نہ لیا جائے جسے کوئی اور رشتہ لا کر جوڑ رہا ہو، جس کا حقیقی محرک اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے سوا اور کچھ ہو، اور جس کے سامنے صرف امر بالمعروف، شہادت حق، اور اقامت دین ہی کا فریضہ انجام دینا نہ ہو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران:۱۰۳)

(۳) قائم ہونے والی تنظیم کے دو حقیقی فرائض ہوں گے، جن سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتی، اور جن پر اس کی کوششیں برابر مرکوز رہیں گی: ایک تو یہ کہ دوسرے افراد ملت کو 'رجوع الی الحق' کی دعوت دے۔ دوسرے یہ کہ افرادِ تنظیم کی تعلیم و تربیت کا اہتمام رکھے۔ ان دونوں باتوں کی ضرورت اور اہمیت بالکل واضح ہے۔ پہلی کا منشا یہ ہے کہ تنظیم کا اکھوا برابر بڑھتا

رہے، یہاں تک کہ وہ تناور درخت بن جائے، اور اُمت کے بکھرے ہوئے اجزا ایک ایک کر کے اس کے نیچے آ جائیں۔ دوسری کی غرض وغایت یہ ہے کہ تنظیم کی اندرونی توانائی برابر قائم رہے، نہ صرف قائم رہے بلکہ بڑھتی رہے۔ اس کے افراد میں ایمان، تقویٰ اور اسلام کی روح مرجھانے نہ پائے، بلکہ پیہم حیات تازہ پاتی رہے۔ ان کے اندر تنظیم سے وابستگی کا حقیقی محرک نہ کبھی کمزور پڑنے پائے، نہ کسی اور محرک سے متاثر ہونے پائے۔

تنظیم نو کی عملی شکل

تنظیم ملت کا طریقہ متعین ہو جانے کے بعد یہ بحث اصولاً تو ختم ہو جاتی ہے، مگر عملاً ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک مسئلہ اب بھی حل طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ اس تنظیم نو کی عملی شکل کیا ہوگی؟ یہ کام کس طرح انجام پائے گا؟ ایک نبی کی موجودگی میں تو یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ لیکن جب صرف امت ہی امت ہو تو یہ ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ البتہ جہاں تک طریقِ تنظیم کے پہلے اصولی نکتے کا تعلق ہے، اس کی حد تک تو عمل درآمد کا معاملہ بالکل صاف ہے۔ کیونکہ یہ بات ہر وقت متوقع ہے کہ فضا میں فرض کا احساس اُبھر آئے، اور کوئی شخص یا کچھ اشخاص 'رجوع الی الحق' کی منادی کرنے اٹھ کھڑے ہوں، اور توقع کی بھی کیا بات ہے؟ ایسا تو کسی نہ کسی شکل میں آئے دن ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن پھر بعد میں کیا ہو؟ کارِ تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکتوں پر عمل کیسے ہو؟ آگے قدم کس طرح بڑھے؟ اس ابھرے ہوئے احساسِ فرض کو اور 'رجوع الی الحق' کی اس ابتدائی منادی کو مطلوبہ تنظیم کی آخری منزل تک پہنچا دینے کا پروگرام کیا ہوگا؟ یہ مسئلہ صاف اور بالکل واضح نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنا حل چاہتا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ اس کا صحیح حل کیا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ اس حل کو تلاش کرنے کے لیے بھی ہمیں کسی اور چیز سے نہیں، بلکہ کتاب وسنت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ یہ رہنمائی ہمیں جن آیتوں اور حدیثوں سے مل سکے گی ان میں سے کئی ایک کتاب کے ابتدائی مباحث میں نقل بھی کی جا چکی ہیں۔ ایک بار ان پر پھر نظر ڈال

لیجیے۔اس کے بعد سوچیے، جو دین ہر کام کو حتی الوسع باہم مل کر، اور ایک امام یا امیر کی قیادت میں انجام دینا ضروری، یا کم از کم یہ کہ پسندیدہ قرار دیتا ہو، جو نماز جیسی بظاہر مکمل علیحدگی اور تنہائی چاہنے والی عبادت کے لیے با جماعت کا مثالی اہتمام اور ایک امام کی معیاری اقتدا واجب قرار دیتا ہو، جو زکوٰۃ، حج اور روزے کی عبادتوں کو بھی ممکن حد تک اجتماعی شکل ہی میں ادا کرنے کا حکم دیتا ہو، جو اس بات تک کو جائز نہ سمجھتا ہو کہ جنگل میں سفر کرنے والے تین آدمی بھی اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر نہ بنائے ہوئے ہوں —— کیا ایسا دین اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ تنظیم ملت جیسی عظیم الشان مہم کسی نظم و قیادت کے بغیر انجام دی جائے؟ اور کیا تنظیم کا یہ طریقہ اس کی ان ہدایتوں سے ہم آہنگ اور اس کے مزاج کے مطابق ہوگا؟ عقلِ سلیم اس سوال کا جواب یقیناً نفی ہی میں دے گی۔ بلاشبہ مکی دَور میں ہم 'جماعت' اور 'امیر' 'نظم' اور 'اطاعت' کے الفاظ بولے جاتے نہیں سنتے۔ مگر یہ نگاہ کا دھوکا ہوگا اگر ہم اس سے یہ خیال کرلیں کہ وہاں ان الفاظ کے معانی بھی موجود نہ تھے۔ جس ذاتِ گرامی پر اس کے فدا کار ساتھی اپنی جانیں چھڑکتے تھے، جو اس آسمان کے نیچے ان کی سب سے محبوب متاع تھی، جس کے اشارے بھی ان کے لیے بڑے سے بڑے آمروں اور شہنشاہوں کے فرامین سے بڑھ کر واجب التعمیل اور قابل احترام تھے، وہ کب اس بات کی ضرورت مند تھی کہ ان کے سامنے اپنی قیادت اور امارت کا قانونی لفظوں میں اعلان کرے، اور ان سے اپنی اطاعت کے عہد نامے لکھوائے! چنانچہ اس پورے دَور میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پایا جا سکتا جو اس بات کا ثبوت ہو کہ وہاں معناً بھی نظم اجتماعی اور نظام اطاعت موجود نہ تھا۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ اہل ایمان کی شان میں ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کے الفاظ مکہ ہی میں نازل ہوئے تھے۔ کیا یہ الفاظ ان لوگوں کے حق میں فرمائے جا سکتے تھے جن میں نہ کوئی اجتماعیت ہو نہ کوئی نظم؟ کوئی شک نہیں کہ تاریخی حقائق کی طرح یہ الفاظ قرآنی بھی اس امر کا ثبوت ہیں کہ مکی دور میں نظم و اطاعت کے الفاظ چاہے استعمال نہ کیے گئے ہوں، لیکن وہاں ایک مضبوط نظم ضرور موجود تھا، ایک جان دار اجتماعیت یقیناً کارفرما تھی، دعوت اور امت کے اہم معاملات میں سر جوڑ کر بہر حال بیٹھا

جاتا تھا، غور و بحث کے بعد فیصلے ہوتے تھے، اور ان فیصلوں کے مطابق ہی پورا گروہ مومنین عمل پیرا ہوتا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اِذن کے بغیر کوئی بات انجام نہ پاتی تھی۔

بہتر ہوگا کہ اس جگہ ایک اصولی حقیقت سمجھ لی جائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تک دعوت حق قبول کرنے والے افراد اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جس طرح کے لوگ مکی دور کے اہل ایمان تھے، اور ان کا داعی و راہنما اس طرح کی شخصیت ہوتی ہے جس طرح کی شخصیت ان کے درمیان وہاں موجود تھی، اس وقت تک 'جماعت' اور 'امارت' 'نظم' اور 'اطاعت' کے الفاظ بولے جانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت ان الفاظ کا بولا جانا اس شخصیت کے مقام عظمت و محبوبیت پر بھی حرف لانا ہے، اور اس کے مخلص پیرووٴں کے جذبۂ محبت و تعظیم کی بھی اک گونہ توہین ہے۔ یہ الفاظ تو صرف اس وقت بولے جاسکتے ہیں جب یہ دونوں باتیں، یا ان میں سے کوئی ایک موجود نہ پائی جاتی ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مکے میں جہاں ''اعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ'' کی تلقین کافی تھی، وہاں مدینے میں ''بِحَبْلِ اللّٰهِ'' کی صراحت ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ''وَلَا تَفَرَّقُوا'' کی کھلی ہدایت بھی ضروری ہوگئی۔[1]

اسی طرح مکی دَور میں نظم و اطاعت کا ظاہر لفظوں میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ مگر مدنی دَور شروع ہوتے ہی ''اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ'' کے الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ مدینے میں پہلی بات موجود نہ رہ گئی تھی، یعنی اس وقت کے 'اہل ایمان' بلا استثنا سب کے سب ویسے ہی مخلص، فداکار اور سراپا اطاعت نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ مکی دَور کے تھے۔ بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد کچے مسلمانوں کی اور منافقوں کی بھی آگھسی تھی، جن کا ایمانی ضعف یا نفاق انھیں دینی مطالبوں کی خلاف ورزیاں کر جانے پر اکسا دیا کرتا تھا۔ اس لیے اب ناگزیر ہوگیا کہ گروہ مومنین کو ایک متحد گروہ بنے رہنے کا، اور اللہ و رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا صریح لفظوں میں بھی حکم دیا جائے۔

---

[1] ''اعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ'' کے الفاظ سورۂ حج کے ہیں جو کہ مکی سورہ ہے، اور ''اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا'' کا ارشادِ الٰہی سورۂ آلِ عمران کا ٹکڑا ہے جو مدنی سورہ ہے۔

یہ تو اس صورت حال کی مثال تھی جب کہ داعی اور رہنما کی شخصیت معیاری اور مثالی قسم کی ہو، مگر اس کے پیرو تمام کے تمام معیاری اور مثالی قسم کے نہ ہوں۔ رہی اس کی اُلٹی صورت حال کی بات، تو اس کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ جہاں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جب بھی کچھ مسلمان کسی ضرورت کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور قیادت سے کچھ دنوں کے لیے الگ ہوتے تو ایک امیر کے بغیر اپنے قدم نہ اٹھاتے۔ مدنی دَور میں آئے دن وفود بھیجے جاتے اور مہمیں روانہ کی جاتی تھیں، مگر کوئی وفد یا کوئی دستہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس کا ایک امیر نہ ہو۔ مکی دَور میں اگرچہ اس طرح کی صورتیں پیش آنے کے حالات و مواقع نہ ہونے کے برابر تھے، لیکن اگر کبھی ایسی صورت پیش آئی تو اس وقت بھی کوئی دوسرا طریقِ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہجرت حبشہ کے موقع پر جب کچھ مسلمان آپؐ کی صحبت سے الگ ہو رہے تھے تو ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص نے اپنے طور پر اپنی راہ لی ہو، بلکہ سب نے ایک جماعت بن کر اور ایک قیادت کے تحت ہجرت کی تھی۔ سب سے پہلا قافلۂ مہاجرین دس آدمیوں پر مشتمل تھا، اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے اس قافلے کا سربراہ مقرر فرمایا تھا۔ (سیرت ابن ہشام جلد اول)

غرض مکی دَور کی ظاہری صورت حال کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہاں فی الواقع بھی کوئی اجتماعی نظم کارفرما نہ تھا۔

اس بحث سے ملت کے طریق تنظیم کے بارے میں دین کا تقاضا اور شریعت کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور کتاب و سنت کی عام اجتماعیاتی ہدایتیں یہی تلقین کرتی ہیں کہ ملت کی اصلاح و تنظیم جدید کا فریضہ اجتماعی طور پر ایک نظم اور ایک قیادت کے تحت انجام پانا چاہیے۔

شرعی نقطۂ نگاہ کے بعد اگر عقلی اور تجرباتی پہلوؤں سے دیکھیے تو بھی بات یہی نکلے گی۔ تاریخ کے وسیع ذخیرے میں اس بات کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پائی جا سکتی کہ دنیا کا کوئی اجتماعی انقلاب کسی اجتماعی اور منظّم سعی و جہد کے بغیر برپا ہوا ہو۔ اس دنیا میں کام کرنے والے قوانین کہتے ہیں

کہ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایک مضبوط اجتماعی نظم کے بغیر اگر تنظیم ملت کی مہم چلائی جائے گی تو وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس سلسلہ میں انفرادی اصلاح و ترتیب کی جو کوششیں انجام دی جائیں گی ان کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اس جنگل میں کچھ مخلص دین دار اور ملّی نظام اجتماعی کی بحالی کے خواہش مند افراد پیدا ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد کی تعداد ''کچھ'' کے بجائے ''بہت'' ہو۔ مگر جب تک اس متفقہ اجتماعی نصب العین کو پا لینے کا جذبہ ان سب کو ایک ہی شیرازے میں مضبوطی سے باندھے ہوئے بھی نہ ہو اور اس غرض کے لیے اجتماعی نظام اور قیادت موجود نہ ہو، ملت اس اجتماعیت سے قیامت تک بہرہ ور نہیں ہو سکتی جو اللہ کے دین کو مطلوب ہے، اور جس کے بغیر، بقول سیدنا عمرؓ، اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ ایسے مخلص، دین دار اور ملّی تنظیم کے خواہش مند افراد کے وجود کو، جو بجائے خود اپنی کوئی تنظیم اور قیادت نہ رکھتے ہوں، ملت کی تنظیم نو کی ضمانت سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے پکی اینٹوں کو اُوپر تلے رکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ کسی جنگی قلعے کی دیوار تیار ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ بڑی ہی عجیب بات ہوگی کہ مسلمانوں کے اور سارے کام تو منضبط طور پر، ایک نظم اور ایک قیادت کے تحت انجام پائیں، ان کا دین ان سے یہی چاہتا ہو، مگر ٹھیک وہی مہم اس طرح کے نظم و انضباط سے بے بہرہ ہو جو ملت کو ایک مضبوط اجتماعیت اور نظم سے بہرہ ور کرنے ہی کے لیے جاری کی گئی ہو! کیا ایسی صورت میں یہ مہم اپنی مخالف خود آپ ہی نہ ہوگی؟ اور کیا اسی کے ناکام ہو جانے کا یقین دلانے کے لیے خود یہی بات کافی نہ ہوگی کہ نظم و اجتماعیت کی اس متلاشی جدوجہد میں سب کچھ ہے مگر ایک نظم و اجتماعیت ہی نہیں ہے؟

غرض جس پہلو سے بھی دیکھیے، ملی تنظیم کے باقی دونوں اصولی نکات کو بروئے کار لانے کی شکل عملاً یہی قرار پائے گی کہ جو لوگ اس مقصد سے شعوری طور پر وابستہ ہو جائیں وہ ایک جماعتی نظم قائم کر لیں، اور اپنے میں سے ایک ایسے فرد کو اس نظم کا سربراہ منتخب کر لیں جو اس مقصد کی سب سے زیادہ اچھی خدمت انجام دے سکتا ہو۔ پھر ان کا ایک مؤثر شورائی نظام ہو جو ''اَمْرُھُمْ شُوْرٰی

بَیْنَھُمْ ‘‘ کے تقاضوں کا حق ادا کرتا ہو، اور اس طرح پورے نظام وضبط کے ساتھ یہ بھاری اور لمبی مہم مسلسل چلتی رہے۔

یہ حقیقت کسی اظہار و بیان کی محتاج نہیں کہ یہ جماعت بجائے خود ’الجماعۃ‘ نہ ہوگی، نہ یہ تنظیم، ملی تنظیم کا بدل ہوگی، بلکہ اسے وجود میں لانے کے لیے ہوگی۔ ’سنتِ رسولؐ‘ اور ’سنتِ خلفائے راشدینؓ‘ کے ہاتھوں میں اس کی زمامِ کار رہے گی۔ اپنی غربت اور اجنبیت سے وہ پہچانی جائے گی۔ دینِ حق اور طریقِ رسولؐ کے جس گوشے کو بھی اجاڑا یا بگاڑا جا چکا ہے اس کی تعمیر و اصلاح میں وہ کسی ممکن سعی سے دریغ نہ کرے گی۔

اَلَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا اَفْسَدَ النَّاسُ.

گوشہ گیری

گوشہ گیری کی مشروعیت

ایک طرف تو ایمان و اسلام کے لیے منظّم اجتماعی زندگی کا وجود اس حد تک ناگزیر ہے جس کی وضاحت پچھلے صفحات پیش کر رہے ہیں، دوسری طرف قرآن حکیم کے بعض اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کھلے ہوئے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعیت سے یکسر ناآشنا اور گوشۂ تنہائی کی زندگی بھی غیر اسلامی زندگی نہیں، بلکہ ٹھیک اسلامی زندگی ہے، اور اسے اللہ و رسولؐ کی رضا حاصل ہے۔ مثلاً:

سورۂ کہف کے دوسرے رکوع کو پڑھیے، جہاں 'اصحابِ کہف' کا تذکرہ ہے۔ یہ اصحاب کہف وہ لوگ ہیں جو انسانی بستیوں سے دُور ہٹ کر ایک محفوظ غار میں جا بیٹھے تھے، اور وہیں اپنے اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہے تھے۔ یوں کہیے کہ غیر اجتماعی زندگی کی آخری شکل انہوں نے اختیار کر لی تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس سرگزشت کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے اُن کی اس روش پر کسی ہلکی سی ہلکی ناپسندیدگی کا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے بخلاف اس نے اسے خدا پرستی کے ایک قابلِ قدر اور اونچے نمونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور ان غارنشینوں کو 'ایمان میں پختہ' اور 'ہدایت میں بلند مرتبہ' قرار دیا ہے:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى۔ (کہف:۱۳)

"بلاشبہ یہ (کچھ) ایسے جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے، اور جنھیں ہم نے ہدایت کی افزونی عطا فرمائی تھی۔"

اسی طرح یہ حدیثیں دیکھیے:

(۱) قَالَ رَجُلٌ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مُؤْمِنٌ یُجَاهِدُ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ مُؤْمِنٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ شِعْبٍ مِّنَ الشِّعَابِ یَعْبُدُ رَبَّهٗ وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ. (مسلم، باب فضل الجہاد والرباط)

''ایک شخص نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل انسان کون سا ہے؟'' فرمایا: ''وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔'' اس نے کہا: ''پھر کون؟'' ارشاد ہوا ''پھر وہ مسلمان جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو، وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے دُور چھوڑے ہوئے ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں ''یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ'' کے موقع پر ''یَعْتَزِلُ شُرُوْرَ النَّاسِ'' (لوگوں کے شر کو چھوڑے ہوئے اور اس سے دُور رہتا ہو) کے الفاظ ہیں۔ (فتح الباری، جلد ۶ صفحہ ۴)

(۲) یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ خَیْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ الْغَنَمُ یَتْبَعُ بِهَا شَعْفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ. (بخاری باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ایک مسلمان کی سب سے اچھی دولت اس کی بکریاں ہوں گی، جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گھومتا پھرے گا، اپنے دین کو سینے سے لگائے فتنوں سے بھاگتا رہے گا۔''

ان حدیثوں کے آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اگر مومن جماعتی زندگی سے الگ ہو کر یادِ حق میں مصروف ہو رہے تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی، بلکہ ایک بہترین رویہ ہوگا جو اس نے اپنایا ہوگا۔

عزیمت نہیں، رخصت

بلاشبہ اس طرح کی باتیں اور ہدایتیں بھی قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اور جب ایک چیز قرآن اور حدیث میں موجود ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح 'اسلامی' ہی ہے جس طرح کہ کوئی اور

چیز ہو سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں 'اسلامی' ہونے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ یہ تنہائی کی زندگی بھی مطلقاً اسلامی زندگی ہے، اور جب بھی اسے اختیار کیا جائے گا ٹھیک اسی طرح معیاری اور اللہ و رسولؐ کی پسندیدہ زندگی قرار پائے گی جس طرح کہ منظم اجتماعی زندگی قرار پا چکی ہے، یا کچھ اور؟ اس سوال کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں ذیل کی تین اصولی باتوں پر غور کرنا ہوگا:

(۱) ایک منظم اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی جو ہدایتیں مسلمانوں کو دی گئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت، اور اُمت مسلمہ کا مقصد وجود، یہ دونوں چیزیں گوشہ نشینی کے رویے کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

(۳) خود قرآن اور حدیث کے وہ ارشادات، جن سے گوشہ نشینی کے رویے کا 'اسلامی' ہونا ثابت ہوتا ہے، اس بارے میں عام اور بے قید ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس سلسلے کی ساری ضروری تفصیلات ہمارے سامنے آ ہی چکی ہیں۔ ان سے حقیقت واقعی قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتی کہ جماعتی زندگی بھی اسلام کو مطلوب ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً صرف جماعتی زندگی ہی اسے مطلوب ہے۔

وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ " **عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ** " (اجتماعی زندگی کو لازم پکڑو)۔

بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ " **اِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ** " (افتراق اور علیحدگی سے پوری طرح دُور رہو)۔

اور یہ کہ **اِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ** " (گلے سے دُور اور الگ ہو جانے والی ہی بکری بھیڑیے کا لقمہ بنا کرتی ہے)۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں لیا جا سکتا کہ شریعت نے جماعتی زندگی بسر کرنے کی جو ہدایت دی ہے اس کی تعمیل اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے۔

رہی دوسری بات، تو نہ تو انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت ہی گوشہ گیری کے

رویے سے میل کھاتی ہے، نہ اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود ہی اسے گوارا کرتا ہے۔ انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' اور اس کی 'عبادت' بتائی ہے۔ اگر گوشہ گیری کی زندگی بھی منظم اجتماعی زندگی ہی کی طرح علی الاطلاق اسلامی زندگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اختیار کرنا کسی حال میں بھی اور کسی شخص کے لیے بھی غلط نہیں ہو سکتا، ہر مسلمان اسے اختیار کر سکتا ہے، ہر فردِ ملت کو اس کی ترغیب دی جا سکتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ تاکید کی جا سکتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم منطقی طور پر ایک ایسی حالت کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے، یا ایسی حالت بھی پسندیدہ اور مطلوب ہو سکتی ہے، جب کہ سارے مسلمان گوشہ میں جا بیٹھے ہوں۔ لیکن یہ صورت حال اگر وجود میں آ جائے تو بجائے خود وہ چاہے جتنی بھی پسندیدہ ہو، اتنی بات تو بالکل قطعی ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ غایت کبھی پوری نہ ہو سکے گی جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' کا فریضہ ادا ہونے کا کوئی عملی امکان ہی باقی نہ رہ جائے گا، اور اس کی عبادت اور غلامانہ اطاعت اس طرح کہیں بھی انجام نہ دی جا سکے گی جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود 'امر بالمعروف'، 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' ٹھیرایا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُمت اگر گوشوں میں معتکف ہو جاتی ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکے گی! آخر جہاں کوئی معاشرہ ہی نہ ہو وہاں 'امر بالمعروف' کے کتنے مواقع پیش آ سکیں گے؟ حق کی شہادت کس طرح دی جا سکے گی؟ اللہ کا دین کہاں اور کن لوگوں پر قائم کیا جا سکے گا؟

اب ان حدیثوں اور قرآنی ارشادات کو لیجیے جن سے گوشہ گیری کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے:

پہلی حدیث میں جہاں کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے والے اور اپنے رب کی عبادت کرنے والے کو ایک اُونچے درجے کا مومن بتایا گیا ہے، وہیں اس کے اندر دو باتیں اور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'راہِ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے

والے مومن' اور 'کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو جانے والے مومن' دونوں کا ذکر ایک ہی ساتھ نہیں فرمایا ہے، بلکہ پوچھنے والے کے اس سوال پر کہ ''سب سے افضل انسان کون ہے؟'' آپ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو رہے کہ ''وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے'' اور جب اس نے دوبارہ پوچھا کہ ''پھر کون؟'' تب اس دوسرے شخص کا تذکرہ فرمایا اور وہ بھی ''پھر'' کے لفظ کی صراحت کے ساتھ۔

دوسری یہ کہ اس گوشہ نشینی کی ایک خاص ضرورت اور اس کا ایک خاص محرک ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ انسان 'دوسروں کو اپنے شر سے' یا اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے بچانا چاہتا ہو۔

یہی حال دوسری حدیث کا بھی ہے۔ اس میں بھی گوشہ گیری کی ترغیب کے ساتھ دو اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

ایک تو یہ کہ ''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔'' دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کوئی غیر معمولی زمانہ ہوگا جس کے کچھ خاص حالات ہوں گے۔

دوسری یہ کہ جب ایسا زمانہ آئے گا تو 'خدا ترس لوگ اپنی بکریاں لے کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اس لیے نکل جائیں گے'، یا انھیں اس لیے نکل جانا چاہیے تاکہ ان کا دین فتنوں سے محفوظ رہے۔

اسی طرح اصحابِ کہف کے جس واقعے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن حکیم گوشۂ تنہائی کی زندگی کو بھی پسندیدہ اسلامی زندگی قرار دیتا ہے، اس کی تفصیل میں یہ امور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ ان حضرات کی تعداد چند سے زیادہ نہیں تھی، جب کہ ان کی پوری قوم مشرک تھی۔

دوسرے یہ کہ قوم کے سامنے انہوں نے اپنے ایمان کا علانیہ اظہار کیا، اسے توحید کی دعوت دی۔

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (کہف: ۱۴)

نہ صرف دعوت دی، بلکہ اتمامِ حجت کی حد تک دعوت دی اور بحث و مناظرے میں اسے بند کر دیا۔

هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ. (کہف:۱۵)

تیسرے یہ کہ غار کو انہوں نے اپنی قیام گاہ نہیں بلکہ پناہ گاہ بنایا تھا، اور یہ پناہ بھی انہوں نے اس وقت لی تھی جب ان کی قوم انھیں برداشت کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اب انھیں بستی میں ٹکے رہنے کے لیے اپنے ایمان اور اپنی جان میں سے ایک کی بھینٹ دینا ضروری ہو گیا تھا۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ. (کہف:۲۰)

قرآن اور حدیث کے ان ارشادات کا یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ ان سے گوشہ نشینی کا رویہ اختیار کرنے کی جو ہدایت ملتی ہے، وہ عام اور بے قید ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بعض قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقید ہے۔ کچھ خاص حالات ہیں جن کے اندر ہی اس رویے پر عمل ہوا کرتا ہے۔ ایک دینی ضرورت، یا یوں کہیے کہ ایک بہت بڑی دینی مجبوری ہوتی ہے جس کے تحت مسلما٠ن کو اُدھر جانا پڑتا ہے۔

گوشہ گیری کی زندگی کس نوع کی اسلامی زندگی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جن مختلف پہلوؤں سے غور و فکر ہونا چاہیے تھا، ان سب پر ہم ضروری حد تک غور و فکر کر چکے۔ اس کی روشنی میں اس خیال کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ گوشہ نشینی کی زندگی اور جماعتی زندگی، دونوں ہر حیثیت سے یکساں طور پر اسلامی زندگی ہیں۔ اس کے برخلاف حقیقت واقعی یہ قرار پاتی ہے کہ اصل اسلامی زندگی صرف جماعتی زندگی ہے، اور بنیادی طور پر صرف وہی قابل اختیار ہے۔ رہی گوشوں کی زندگی، تو وہ اصل اسلامی زندگی ہرگز نہیں ہے کہ اسے عام حالات میں اختیار کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ وہ صرف 'عارضی قسم' کی اسلامی زندگی ہے، جسے بعض خاص حالات میں، اور انتہائی اہم مجبوری کے وقت ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ خاص حالات 'فتنہ و شر کے حالات ہیں، اور یہ انتہائی اہم مجبوری، اپنے دین و ایمان کی مجبوری ہے۔ یعنی وہ جماعتی زندگی، جو مسلمان کو دراصل اپنے دینی تقاضے پورے کر سکنے اور اپنے ایمان کی نشو و نما ہی کے لیے مطلوب ہوتی ہے،

جب اپنی اس حیثیت سے بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے، اپنی یہ مطلوبہ افادیت کھو دیتی ہے، اور دین و ایمان کے معاملے میں الٹا عمل کرنے لگتی ہے، تو وہ اسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور بڑے قلق اور انتہائی حسرت کے ساتھ گوشوں والی زندگی گوارا کر لیتا ہے۔ جہاں انسانی تخلیق کی غرض و غایت، اور اُمتِ مسلمہ کا مقصد وجود پورا کر سکنے کے مواقع ایک قابل لحاظ حد تک بالکل ناپید ہوتے ہیں، اور اللہ کی بندگی صرف ادھوری ہی کی جاسکتی ہے۔

غرض ایمان و اسلام کا اصل وطن تو جماعتی زندگی ہی ہے، اور وہ جیسا چاہیے وہیں پروان چڑھ سکتے اور برگ و بار لا سکتے ہیں۔ لیکن جب ان کا یہ 'وطن' انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا تو وہ مجبوراً سرزمین غیر میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں، اور گوشوں میں جا کر مسافرت کی جیسی تیسی زندگی گزار لے جانے کے سوا ان کے لیے کوئی اور چارہ نہیں رہ جاتا۔

صرف یہی نہیں کہ گوشہ گیری کی زندگی عارضی قسم کی اسلامی زندگی ہے، بلکہ جماعتی زندگی کے مقابلے میں اس کا درجہ بھی 'ثانوی' قسم کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زندگی کو مجبوری کی وجہ سے اور دین و ایمان کے مفاد ہی میں اختیار کیا جاتا ہے، اور اس میں اپنی کسی کوتاہی کا دخل نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود امرِ واقعی یہی ہے، اور یہ 'مجبوری' اور 'بے قصوری' اس طرزِ زندگی کو اصل اسلامی زندگی کا ہم پایہ نہیں بنا دے سکتی، نہ گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اجتماعی زندگی میں رہ کر یہ فرض بجا لاتا ہے۔ اس فرقِ مراتب کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ پہلے شخص کی عبادت، نماز روزے وغیرہ چند انفرادی اعمال بندگی تک محدود رہتی ہے، جب کہ دوسرے کی عبادت ان انفرادی اعمال سے شروع ہو کر جانی اور مالی جہاد فی سبیل اللہ جیسی آخری حدودِ بندگی تک وسیع ہوتی ہے۔ اس لیے حق یہی ہے کہ پہلے کا مرتبہ دوسرے سے فروتر ہو۔ یہ صرف عقل اور قیاس ہی کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورۂ بالا ارشادات میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔

پوچھنے والے نے جب پوچھا کہ سب سے افضل انسان کون ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے اس کے جواب میں اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کرنے والے مومن، اور کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو کر اللہ کی عبادت کرنے والے مومن، دونوں کا ساتھ ساتھ تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ صرف پہلی قسم کے مومن کا ذکر کر کے خاموش ہو رہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں ''سب سے افضل انسان'' صرف اسی طرح کے اہل ایمان ہوتے ہیں، کوئی دوسرا مومن ان کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ جب دوبارہ پوچھا گیا کہ ''پھر کون؟'' تو ارشاد ہوا کہ:

''پھر وہ مومن جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو اور وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو۔''

یہ پوچھنے والے کا ''پھر'' کا لفظ استعمال کرنا، اور آپؐ کی طرف سے جواب کا بھی اسی لفظ سے شروع ہونا اس حقیقت کو روشن تر کر دیتا ہے کہ گوشہ نشینی کا مقام جماعتی زندگی کے مقابلے میں بہر حال فروتر اور ثانوی درجے کا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے یوں کہا جائے گا کہ گوشہ گیری کا راستہ 'رخصت' کا راستہ ہے، عزیمت کا نہیں۔ چنانچہ امام ابوداودؒ نے اپنی سنن میں گوشہ گیری سے متعلق حدیث بیان کرنے کے لیے باب ہی ''الرخصة فی التبدی فی الفتنة'' کے عنوان کا قائم کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرز زندگی کے 'اسلامی' ہونے کے باوجود ہم کسی پیغمبر کا اسوہ اس کے حق میں نہیں پاتے۔ ہزاروں انبیا میں سے کوئی نہ تھا جس نے کبھی اس روش کو اپنایا ہو۔ حالانکہ انھیں جس طرح کے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، ہم اس کا ٹھیک ٹھیک تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ وہ اللہ کے رسول تھے، اس لیے ان کے لیے ایک ایسی روش کا اختیار کرنا ممکن نہ تھا جسے اختیار کرنے کے بعد وہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو رہتے، اور جو عزیمت کی نہیں رخصت کی راہ تھی۔ اور یہ اس لیے کہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو جانے کے بعد تو وہ پیغمبری کا فریضہ ہی انجام نہیں دے سکتے تھے، اور رخصت کی راہ اپنانے کی ضرورت انھیں اس لیے نہیں پیش آ سکتی تھی کہ لوگوں کو

اپنے شر سے بچانے' یا اپنے (دین وایمان) کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ رہی جان کے خطرے کی بات، تو یہ حضرات اپنی جان کو اپنی سمجھتے ہی کب تھے کہ اسے بچانے کے لیے وقت کے جباروں سے دُور بھاگنے کے ضرورت مند ہوتے۔

حالات وشرائط

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن میں شریعت نے رخصت کی یہ راہ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے؟ جہاں تک اس سوال کے اصولی جواب کا تعلق ہے وہ تو اُوپر کی بحث میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کی ہدایت یا رخصت صرف اس وقت ہے جب معاشرہ 'شر اور 'فتنہ' کی لپیٹ میں آ گیا ہو، اور صرف اس شخص کو ہے جو اس شر اور فتنے سے اپنے دین وایمان کو بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ چنانچہ دوسری حدیث کے الفاظ:

"یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ"

صاف اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ اسی طرح پہلی حدیث کے بارے میں بھی علمانے صراحت کی ہے کہ اس میں "کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے" کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق صرف فتنوں کے زمانے سے ہے۔

وھو مقید بوقوع الفتن. (فتح الباری، جلد ٦)

اور خود حدیث کے آخری الفاظ "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس مجمل اور اصولی جواب سے بات غالباً پوری طرح واضح نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس 'فتنے' اور 'شر' کی نوعیت متعین کی جائے جس کا ان حدیثوں میں ذکر ہے، اور معلوم کیا جائے کہ اس سے کس قسم کا فتنہ وشر مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مطلق فتنہ وشر تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے تو دنیا کا کوئی زمانہ بھی فتنے اور شر سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود

دَورِ نبوت اور دَورِ خلفائے راشدین بھی بے فتنہ اور بے شر نہ تھے۔ کیونکہ ان دنوں بھی کم از کم نفاق کے فتنے تو موجود ہی تھے، اور باہمی اختلافات کے خون ریز ہنگامے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ 'فتنہ وشر' جس میں مومن کو اجتماعی زندگی سے اور اس کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر صرف اپنی ہی فکر میں لگ جانے کی رخصت دی گئی ہے، لازماً غیر معمولی قسم کا فتنہ وشر ہے۔ کس حد تک اور کس قسم کا غیر معمولی؟ اس امر کی وضاحت کے لیے مذکورہ احادیث کے ان جملوں پر پھر سے اور گہری نظر ڈالیے:

"یَفِرُّ بِدِیْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ" "یَعْتَزِلُ شُرُوْرُ النَّاسِ" "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ "شر" اور "فتنے" سے مراد معاشرے کے ایسے سخت ابتر حالات ہیں جن کے اندر مسلمان اپنی ساری حفاظتی تدبیروں کے باوجود اپنے دین وایمان کو محفوظ نہ پاتا ہو، اور شر و باطل کے بڑھتے ہوئے زبردست دباؤ میں ان کا مستقبل اسے تاریک دکھائی دیتا ہو۔ اس حد تک تاریک کہ اب دوسروں کی برائیاں اس کے دل و دماغ پر بھی اثر ڈال دیں گی، اور وہ بھی ماحول کی نجاستوں میں لت پت ہو رہے گا، اور کچھ بعید نہیں کہ کل وہ خود ہی برائی کا پرچارک اور فتنہ وشر کا علم بردار بن جائے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حالات ایسے خراب نہ ہوں، کہ دین وایمان کے حق میں انھیں اتنا خطرناک کہا جا سکے، تو پھر اس رخصت پر عمل کرنا صحیح نہ ہوگا، اور ایسی شکل میں مومن کو اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ جماعتی زندگی سے علیحدہ ہو جائے، ملی نظم واجتماعیت کے مطالبات سے منہ موڑ لے، صرف اپنی ہی ذات سے واسطہ رکھے، اور ملت کو اپنے حال پر چھوڑ دے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی اجتماعی حیثیت بھی کھوتی چلی جائے، اور اس کی راکھ کے اندر خیر و صلاح کی جو چنگاریاں دبی دبائی موجود ہوں وہ بھی روز بروز بجھتی چلی جائیں، اور اس طرح وہ اپنے مقصدِ وجود سے عملاً دور سے دور تر ہوتی چلی جائے۔ ہاں اس رخصت پر عمل اُس وقت ضرور

قابل برداشت ہوسکتا ہے جب ملت میں مطلوبہ نظم اجتماعی بالفعل موجود ہو، اور معاشرے میں خیر غالب ہو۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ اپنے مخصوص ذوق کی بنا پر گوشوں میں جا بیٹھیں اور باہر کی دنیا سے بے تعلق ہورہیں، تو کہا جاسکے گا کہ ملت بحیثیت مجموعی اپنا فرض پورا کررہی ہے اور اس کی بہت بڑی اکثریت اس کی خدمت اور پاسبانی میں لگی ہوئی ہے، اس لیے کوئی مضائقہ نہیں اگر کچھ لوگ گوشہ نشین ہوگئے ہیں اور اپنی ہی ذات تک اپنی تربیتی اور دینی کوششیں محدود کر بیٹھے ہیں، اگرچہ پھر بھی اتنی بات تو لازماً کہی جائے گی کہ انہوں نے ایک زیادہ اچھے کام کو چھوڑ کر کم اچھے کام پر قناعت کرلی ہے ـــــ لیکن اگر ملت اس حال میں نہ ہو، اگر وہ اپنا جماعتی نظم کھوتی جارہی ہو، اگر مومن ''الجماعۃ'' سے بھیڑ بنتے جارہے ہوں، اگر اگر مسلم معاشرے کا اجتماعی رُخ اسلام کے بجائے کسی اور طرف ہو چلا ہو، مختصر یہ کہ صحیح اسلامی نظام اجتماعی اگر کارفرما باقی نہ رہ گیا ہو تو کسی واقعی خطرۂ دین کے بغیر گوشہ گیر ہوجانا اور ملت کی اجتماعی زندگی کو سسکتا چھوڑ دینا ہرگز اسلامی طرز بندگی اور دینی طریق زندگی نہیں۔

عمل کی صورتیں

آخر میں ایک مسئلہ اور وضاحت طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ 'گوشہ گیری' کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اور 'اعتزال' (اجتماعی زندگی سے علیحدگی) کی جس روش کے اختیار کرنے کی رخصت شریعت نے دی ہے، اس کی حدود کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کسی ایک ہی صورت کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا انحصار تمام تر حالات پر ہے، جو ہر شخص کے لیے، اور ہر زمانے میں یکساں نہیں ہوسکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے دین و ایمان کے لیے حالات جس حد تک ناسازگار اور خطرناک ہوں گے، اسی کی مناسبت سے اسے گوشہ نشینی اور اعتزال کی شکل بھی اختیار کرنی ہوگی، مثلاً:

یہ حالات اگر خدانخواستہ، ابتری کی اس حد کو پہنچ گئے ہوں کہ دین کے بنیادی اصولوں پر

بھی قائم رہنا دشوار ہو چکا ہو، اور اس کی بنیادی تعلیمات کا اعلان و اظہار بھی برداشت نہ کیا جاتا ہو تو اس وقت 'گوشہ گیری' کے انتہائی مفہوم اور اس کی آخری شکل کو اختیار کیا جائے گا۔ جس کی مثال اصحابِ کہف کے اُسوہ میں موجود ہے۔ انہوں نے مکمل علیحدگی اور غار نشینی اس وقت اختیار کی تھی جب ان کے لیے اپنی بستی کے اندر کلمۂ حق کہنے کی اجازت باقی نہ رہ گئی تھی، اور انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اب دعوتِ حق لوگوں کے سامنے ہماری زبانوں سے نکلی کہ ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔

اور اگر حالات اتنے خطرناک نہ ہوئے ہوں تو اُس وقت گوشہ گیری اور علیحدگی کی جو شکل اپنائی جائے گی، وہ ایسی نہ ہوگی، بلکہ اس سے بہرحال کم تر درجے کی ہوگی۔ یعنی کچھ اس طرح کہ انسان آبادی کو یک قلم تو نہ چھوڑے، مگر عام اجتماعی معاملات سے الگ ہو جائے، فتنے کے علم برداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اور ان کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے ہاتھ اور زبان کی کوششوں کے بجائے صرف دل سے برا ماننے پر اکتفا کر لے۔ بس اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے لیے کوئی جائز ذریعۂ معاش، جو بہرحال معمولی قسم ہی کا ہو سکتا ہے، اختیار کر لے اور اپنی آخرت کی فکر میں لگ جائے، نماز اور روزے، حج اور زکوٰۃ کا اہتمام رکھے اور عام انسانوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرتا رہے۔

جہاں تک عام اندازے کا تعلق ہے، ایک بدتر سے بدتر مسلم معاشرے میں بھی جس خراب صورت حال کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے، وہ بس اسی قسم کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود ان حدیثوں میں، جن کے اندر اس 'اعتزال' اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کی رخصت یا ہدایت دی گئی ہے، نماز کی اقامت اور اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ادائے زکوٰۃ کا حکم بھی موجود ہے۔ یہ حکم صاف طور سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائی اسی وقت عمل میں آ سکتی ہے جب دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق کچھ نہ کچھ باقی ہو۔ غاروں اور گپھاؤں میں تو اس کی کوئی عملی شکل

ممکن ہی نہ رہے گی۔

فیصلے میں احتیاط کی ضرورت

آخر میں اس اہم ترین حقیقت کا یاد دلا دینا بھی ضروری ہے کہ حالات کی نزاکت اور خطرناکی کا درجہ متعین کرنے میں بڑے سخت اور انتہائی بے لاگ جائزے سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دو رُجحانات ایسے ہیں جو اس معاملے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں زبردست روک بن سکتے ہیں اور بنتے رہے ہیں:

ایک تو گوشہ نشینی کا رُجحان۔

دوسرا تن آسانی کا رُجحان۔

اس لیے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کوئی شخص ان میں سے کسی رجحان کی بنا پر گوشہ گیری کی طرف بذات خود مائل ہو جائے، اور اپنے اسی ذاتی میلان کے زیر اثر حالات کی خطرناکی کا اندازہ کرنے میں مبالغہ کر بیٹھے، اور انھیں اپنے دین وایمان کے حق میں اتنا خطرناک سمجھ لے جتنا کہ وہ فی الواقع نہ ہوں اور پھر گوشہ نشینی کے بارے میں وارد ہونے والی حدیثوں کو اپنے لیے ایک سہارا بنا کر ملی تنظیم اور جماعتی زندگی سے الگ ہو جائے، یا اگر یہ تنظیم اور اجتماعیت موجود نہ ہو تو اسے ازسرِ نو قائم کرنے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد قرار دے لے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ دراصل اپنے ذاتی ذوق ورُجحان کی تسکین کے لیے ہوگا، احادیثِ رسولؐ کی پیروی کے لیے نہ ہوگا۔

ایک مومن کی حقیقی پسند اور اس کی آخری کوشش تو اس کے بارے میں یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، اجتماعیت سے چمٹا رہے اور اس کی بقا و ترقی یا بحالی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے، اور اس سے علیحدگی کی اُسی وقت سوچے جب وہ اس کے دین وایمان کے لیے فی الواقع کھلے ہوئے خطرے کی شکل اختیار کر چکی ہو۔ اور اس وقت بھی اس کی یہ علیحدگی کسی احساس پسندیدگی

کے ساتھ نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اسلام نے دین اور دین داری کا جو تصور دیا ہے، اس کی رُو سے یہ فی الواقع کوئی پسند کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ دینا کچھ بڑھے ہوئے ناخنوں کا تراش پھینکنا نہیں ہے کہ اس سے راحت محسوس کی جائے، بلکہ گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا ہے جس کی اذیت اٹھانے کے لیے کوئی ذی شعور اپنی خوشی سے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀